پرورش بھی نہیں کرتے، معاشرتی خرابیوں کے ضمن میں نسلی امتیاز، گورے کالے کے فرق، گھریلو اور شہری زندگی کی تلخی، زوجین میں الفت و محبت کے فقدان طلاق کی کثرت رواج، فواحش و منکرات کے فروغ، مہلک اور ایٹمی ہتھیار ایجاد کرنے وغیرہ کا ذکر ہے۔ مصنف نے کلیسا کے مظالم، عیسائیوں کے تصور و طریقہ عبادت کی خامیوں اور عبادت گاہوں کو بھی رقص و سرود اور لطف و تفریح کی جگہ بنا لینے کا ذکر کیا ہے اور عیسائی مذہب کی ترقی و اشاعت، عیسائی مشنریوں کی بے نظیر تبلیغی مساعی، مذہب اسلام کے خلاف ان کے زبردست پروپگنڈے اور مسلمانوں کی تبلیغ و اشاعت دین سے غفلت کا افسوس کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، مگر اس کے باوجود اسلام کی مقبولیت میں اضافہ اور افریقہ میں اس کی ترقی کے امکانات بھی دکھائے ہیں، دوسرے حصہ میں دنیا کی موجودہ مشکلات کا حل اسلام کو بتادیا گیا ہے، اور مغربی مفکرین کے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ ان کے تمدن کی اچھی چیزوں میں اسلامی اثرات و نقوش کی چھاپ ہے، جس زمانہ میں مغربی قومیں نیم وحشی تھیں اس وقت مسلمانوں نے علوم و فنون کو ترقی کی معراج پر پہنچا دیا تھا، اور طبقہ واریت اور نسلی امتیاز کے خاتمہ اور معاشرتی اصلاح کے بارہ میں اسلام کے اصول و آئین بتائے ہیں، اس سلسلہ میں عورتوں کے حقوق، ناگزیر حالات میں طلاق و تعدد ازدواج کی ضرورت واضح کی ہے، مصنف نے جہاد کی حقیقت و غرض بھی بتائی ہے، اور لکھا ہے کہ اس کا مقصد وحشت و بربریت اور قتل و غارت گری اقوام نہیں ہے، اردو میں اس موضوع پر بعض کتابیں پہلے سے موجود ہیں، یہ کتاب بھی اچھی ہے لیکن اسلامی تاریخ کے واقعات بطور مثال پیش کرتے ہوئے صرف حضرت علیؓ اور عباسی خلیفہ مامون کے دور کے واقعات ہی منتخب کئے گئے ہیں، ایک جگہ دور فاروقی کے واقعات نقل کئے ہیں، مگر حضرت عمر فاروقؓ کا نام نہیں آنے دیا ہے، ایک حقیقت پسند مصنف کو فرقہ و مسلک کے اختلاف سے بالاتر اور اس قسم کی عصبیت سے خالی ہونا چاہئے، متعہ کے جواز اور محاسن کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس مختصر تبصرہ میں اس کی تردید کی گنجائش نہیں، لیکن اس کی حرمت کو صرف حضرت عمرؓ کی ذاتی رائے قرار دینا واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے، ترجمہ میں زبان و بیان کی فرو گذاشتیں رہ گئی ہیں، عبارت میں ژولیدہ بیانی، حشو و زوائد اور لفاظی کے علاوہ جملوں کا دروبست بھی ٹھیک نہیں ہے، کہیں تو عربی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ استعمال کئے ہیں اور کہیں رکیک اور سوقیانہ الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کی غلطیاں بکثرت ہیں۔ "ض"

ماہ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۱ء عدد ۶

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۴۰۵-۴۲۸

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا مسعود گنج شکرؒ کے مجموعۂ ملفوظات راحت القلوب کا مطالعہ — جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی — ۴۲۹-۴۴۸

حضرت مسیحؑ کے بعد نصرانیت کا نیا قالب — ضیاء الدین اصلاحی — ۴۴۹-۴۷۲

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین کی فتنہ انگیزیاں — ع۔ ص — ۴۷۳-۴۷۷

مطبوعات جدیدہ — ض — ۴۷۸-۴۸۰

شذرات

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے سلسلہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بے شمار لوگوں کی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربسجود ہوئیں جن کی یہ دعائیں تھیں کہ "خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ مسلم کا ذریعہ پیدا کر"۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی خوش تھے کہ یہ دارالعلوم ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔

یہاں جو تعلیمی نظام قائم ہوا، اس سے دینی و روحانی تربیت کا ایک عمدہ سانچہ بن گیا جس میں ڈھل کر نکلنے والوں میں اعتقادی و عملی اور ظاہری و باطنی عناصر کا ایک ایسا امتزاج دیکھنے میں آیا کہ ابنائے دارالعلوم فخر سے کہنے لگے کہ اس کی مثال ہندوستان تو ہندوستان شاید بیرونِ ہند کے کسی اسلامی ملک میں آسانی سے نہیں مل سکتی، مگر اسی شہرۂ آفاق ادارہ میں وہاں کے موجودہ علماء میں جو باہمی لا اعتباری، بے اعتمادی، آبروریزی، الزام تراشی، بہتان طرازی، عیب جوئی اور ہرزہ سرائی کے نمونے برسرِ عام آرہے ہیں، اس سے اس برصغیر کے مسلمانوں کی گردنیں ندامت اور ذلت سے جھکی ہوئی ہیں۔

وہاں کے اختلافات میں کون فریق حق پر ہے اور کون نہیں ہے، اس پر فیصلہ کرنے کا وقت نہیں رہا، دور کے تماشائی کو یہ کہنے کا حق حاصل ہو گیا ہے کہ جب تک یہ خدمت اور ایثار کا مرکز تھا تو اپنی مالی تنگی اور صبر آزما عسرت کے باوجود سارے برصغیر کے مسلمانوں کے ذہن کا الحمرا، الزہرا، قصرِ شیریں اور لال قلعہ بنا رہا، اس سے ان کی نشاط انگیز اور انبساط آمیز عقیدت کا اظہار اس کے صد سالہ جشن کے موقع پر ۱۹۸۰ء میں ہوا، ایک بے پناہ ہجوم نے اس فخر روزگار اور مایۂ ناز درسگاہ کی عظمت و جلالت کے غیر مرئی پیکر کو اپنی مدہوشانہ اور سرشارانہ محبت کا مرجع کا رہ بنا یا اس پر مختلف گوشوں سے دولت کی ایسی بارش ہوئی کہ اس کے خزانہ میں اتنا بڑا سرمایہ جمع ہو گیا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔

مگر اس جشن کے بعد ہی وہاں جو اختلافِ مذموم کا آغاز ہوا تو یہ کہنے کی گنجائش نکل آئی کہ اس سحر گاہی دعا کے ثمرہ کے احاطہ میں دولت آئی تو اس کے پیچھے دنیا کی برائی بھی آ گئی، حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے عہد کا یہ سبق آموز واقعہ ہے کہ سنہ ۱۶ھ میں جلولا فتح ہوا تو تین کروڑ کا مال غنیمت ہاتھ آیا، اس میں سے پانچواں حصہ مدینہ منورہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بھیجا گیا، تو مسجد نبویؐ میں اس کا ڈھیر لگا دیا گیا، شام ہو چکی تھی اس لیے اس کی تقسیم نہیں ہو سکی، اس پر چادر ڈال دی گئی، رات بھر پہرہ پڑا، صبح ہوئی تو حضرت عمرؓ تشریف لائے، مجمع عام میں چادر ہٹائی گئی، درہم و دینار کے انبار کے اور جواہرات کے ڈھیر تھے، حضرت عمرؓ ان کو دیکھ کر بے ساختہ رو پڑے، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ رونے کا کیا محل ہے؟ فرمایا کہ جہاں دولت کا قدم آتا ہے وہاں رشک بھی آتا ہے اور حسد بھی۔

رشک اور حسد عموماً بدگمانی سے پیدا ہوتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق شیطان بن کر انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے، اگر ہماری تاریخ میں علمائے ربانی کی ایک کثیر جماعت ایسی بھی رہی ہے جنھوں نے رشک و حسد سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کی مذہبی، ملی اور معاشرتی زندگی سنواری ہے، ابراہیم بن یزید تیمی بڑے جلیل القدر تابعی تھے، ان کا مسلک ان ہی کے قول کے مطابق یہ تھا کہ میں آسمان سے منھ کے بل گرنا پسند کرتا ہوں مگر یہ گوارا نہیں کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کا سوءِ ظن رکھوں، حضرت جعفر صادقؒ کی رگوں میں صدیقیت کا بھی خون تھا وہ فرماتے کہ جب تمھارے بھائی کی جانب سے تمھارے لیے کوئی ناپسندیدہ بات ظاہر ہو تو اس کے جواز کے لیے ایک سے ستر تک تاویلیں تلاش کرو، اگر پھر بھی نہ ملے تو سمجھو کہ اس کی کوئی تاویل ضرور ہوگی جس کا تم کو علم نہیں، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم کسی مسلمان سے کوئی کلمہ سنو تو اس کو بہتر سے بہتر معنی پر محمول کرو، جب وہ محمول نہ ہو تو اپنے نفس کی ملامت کرو۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند کے علماء اپنے اپنے نفس کا محاسبہ کریں تو ان کو مشہور تابعی حضرت مطرف بن عبداللہؒ کے اس قول کی تائید کرنی ہوگی کہ فتنہ رہبری اور رہنمائی کے لیے نہیں بلکہ مومن کو اس کے نفس سے لڑا دینے کے لیے اٹھتا ہے، حضرت حسن بصریؒ فرماتے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن خود اس کا نفس ہے جو اس کو فریب میں مبتلا کر کے برباد کر دیتا ہے، وہ شرک اور فریب نفس کو برابر سمجھتے، کہتے کہ اگر مسلمان اپنے نفس کا جائزہ نہیں لیتا اور اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں تو اس کے چوکی کی چاپ ضعیف نسان دین برباد کر دینے کے لیے کافی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے علماء اپنے نفس کو ٹٹولیں اور پھر فیصلہ کریں کہ کیا ان کے جو قوتیں کی جا رہی ہے کہ ضعیف نہیں بلکہ ایک عظیم الشان

مدرسہ تباہی کے دہانے پر نہیں آ گیا ہے؟ یہ دونوں فریقین بزبان حال سے کہہ رہا ہے ؎

آنکھیں کہیں کہ دل ہی نے مجھ کو کیا خراب — دل یہ کہے کہ آنکھوں نے مجھ کو ڈبو دیا

بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے درد عشق میں — دونوں کی ضد نے مجھ کو بلا میں ڈبو دیا

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ کی وفات پر سر سید احمد خان نے لکھا تھا کہ "مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی یا خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال بلاشبہہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کیلئے تھے۔ ان کا کسی سے ناراض ہونا اور خوش ہونا بھی خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو وہ اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔ مسئلہ حب فی اللہ اور بغض للہ ان کا خاص برتاؤ تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی تھیں۔"

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) کی تعلیم یہ ہے کہ "کسی کو اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہیے، حب جاہ نہایت برباد کرنے والی چیز ہے، یہ اس قدر تیز مرض ہے کہ صوفیہ فرماتے ہیں میرے بھائی نفس اعدی عدو انسانی ہے، اس کے مکر و فریب سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، ہم لوگ اپنی غلطی اور نفسانی شرارتوں کو چھپا سکتے ہیں مگر جس سے سابقہ پڑتا ہے اس سے نہیں چھپا سکتے، نجات صرف صاحب قلب سلیم کو ہوگی" (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۱ ص ۲۶۰)

دار العلوم دیوبند کے علما کے لیے اب بھی موقع ہے کہ وہ ان علمائے ربانی کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کریں ورنہ ان پر ایسے ہی دنیا دار علما کا الزام آئے گا جن سے گذشتہ تاریخ میں ہمارے مذہبی اور ملی معاشرہ کو بڑا نقصان پہونچا ہے، ایک مشہور تابعی بزرگ سعید بن جبیرؒ سے ہلال بن خباب نے پوچھا کہ مسلمانوں کی ہلاکت کہاں سے ہوگی؟ فرمایا کہ ان کے علما کے ہاتھوں۔ علما سے ان کی مراد دنیا دار علما ہی تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ فرما گئے ہیں کہ جس طرح مخلوقات کی خلاصی علما کے وجود سے وابستہ ہے اسی طرح دنیا کا خسارہ بھی ان ہی سے مربوط ہے، بہترین علماء دنیا کی بہترین مخلوق ہیں، بدترین علماء دنیا کی بدترین مخلوق ہیں، تمام دنیا کی ہدایت اور گمراہی ان ہی پر موقوف ہے، حضرت مجددؒ کے خیال میں علما کیلئے دنیا کی محبت اور رغبت ان کے جمال کے چہرہ پر بدنما داغ ہیں، وہ علماء کو پارس پتھر کی طرح دیکھنا چاہتے تھے کہ تانبا اور لوہا بھی اس سے مس ہو جائے تو سونا ہو جاتا ہے۔

اس برصغیر کے مسلمان دار العلوم دیوبند کے علما کے جھگڑے کو دور سے دیکھ کر اس انجام کے منتظر ہیں کہ کلام پاک میں بتایا گیا ہے کہ جھگڑنے والے بسا اوقات جس چیز کو سمجھتے ہیں کہ وہ بہتری ہے وہی انجام کار کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے، خدا کرے دیوبند کے جھگڑے کا انجام بھی کلام پاک کی اسی بشارت کے مطابق ہو۔

آخر میں ہم اس برصغیر کے عام مسلمانوں کی طرف سے حضرت حسن بصریؒ کے الفاظ میں بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں کہ اے مقلب القلوب، فریب نفس اور نفسانیت سے بچا کر ہمارے اور ہمارے علماء کے دلوں کو اپنے دین پر قائم اور استوار رکھ اور اسلام قیم ہمارا اور ہمارے علما کا دین بنا۔ آمین۔

مقالات

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۱)

دار المصنفین کی بزم میں شرکت کی دعوت

میں جامعہ میں مشکل سے چھ مہینے رہا کہ سید صاحبؒ نے مجھ کو دار المصنفین طلب کر لیا اور ایک خط میں تحریر فرمایا کہ دار المصنفین میں تاریخ ہند پر کام شروع کر دیا گیا ہے، تم کو تاریخ ہند سے دلچسپی رہی ہے، تم پسند کرو تو یہاں آجاؤ اور تاریخ ہند پر کاموں میں حصہ لو، یہ پورا خط مقالات سلیمان جلد اول ص ۱۲ پر چھپ گیا ہے۔

دار المصنفین میرا ذہنی مکہ بنا ہوا تھا، میں جنوری ۱۹۳۵ء میں وہاں پہونچ گیا، میں نے شروع میں خود ہی یہاں سے کوئی ماہانہ تنخواہ لینا پسند نہیں کیا، کیونکہ ابھی صحت کی خرابی کی وجہ سے ایم۔ اے۔ نہ ہونے کی کھٹک باقی تھی، اور جلد از جلد یہ ڈگری حاصل کرنے کی فکر میں تھا، یہ خیال بھی غالب رہا کہ میں یہاں کے کام کے لائق بن بھی سکوں گا یا نہیں، اس زمانہ میں دار المصنفین میں تاریخ ہند کی تدوین اور ترتیب کی اسکیم بڑے زور و شور سے چلائی گئی تھی، خیال تھا کہ یہ پندرہ (15) جلدوں میں لکھی جائے گی، مولانا عبد السلام ندوی کو ایک جلد لکھنے کے لیے دی گئی تھی، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی بھی اس سلسلہ میں دار المصنفین بلا لیے گئے

اور وہ تاریخ سندھ لکھ رہے تھے، سید صاحب نے مجھ کو بھی تاریخ ہند کے کام میں لگایا اور میرے لیے ایک سخت موضوع کا انتخاب کیا، یہ "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا فوجی نظام" تھا، موضوع سنتے ہی پسینہ آگیا، مگر ان کا اصرار ہوا کہ میں اس پر پوری محنت کروں، ان کی پوری علمی زندگی محنت شاقہ پر مبنی تھی، اس لیے اپنے شاگردوں میں وہی محنت اور ریاضت دیکھنا پسند کرتے تھے؛ ان کے یہاں اس راہ میں تن آسانی اور سہل انگاری علمی جرم کی حیثیت رکھتی تھی، وہ خود محنت کرتے کرتے محلول ہو چکے تھے، ان کا جسم روئی کی طرح ہوگیا تھا، اس کو چھونے سے معلوم ہوتا کہ اس میں ہڈی باقی نہیں رہ گئی ہے، اس محنت کی بدولت ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی، خدا جانے کن کن امراض میں مبتلا ہوئے،

معارف کی مضمون نگاری

اب میں اپنے کو دارالمصنفین کے معیار کے مطابق بنانے میں لگ گیا، اس میں جناب شاہ معین الدین احمد ندویؒ بہت معاون ہوئے، حضرت سید صاحبؒ کی ذات گرامی کی خوبی یہ تھی کہ ان کی لکھنے کی میز پر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو معلوم ہوتا کہ ان کے آفتاب علم کی شعاعیں پڑ رہی ہیں، ذہن اور ادراک دونوں پر علم کی چاندنی پھیل رہی ہے، وہ اپنی علمی و ادبی رہنمائی کے سلسلہ میں صرف دو چار جملے کہہ دیتے تو ساری چیزیں روشن اور منقح ہو جاتیں، علم کے بند دریچے خود بخود کھل جاتے، ان کے سامنے کوئی تحریر پیش کی جاتی تو اس کو یا تو پسند کر لیتے یا رد کر دیتے، یا ضروری ہدایات دے کر پھر سے لکھنے کو کہتے، مگر ان کو کاٹ پیٹ کر مواد یا زبان کو درست کرنے کی فرصت نہ ملتی، اپنی تحریروں کو تو مسلسل کاٹ چھانٹ کرتے رہتے، یہاں تک کہ کاتب کو پڑھنے میں دقت ہوتی، اسی لیے بعض اوقات کسی خوشنویس سے اپنا مسودہ صاف کراتے، اور جب وہ صاف ہو کر سامنے آجاتا تو مزید کاٹ چھانٹ کرنے لگتے، فرماتے کہ ان کو صاف مسودہ کی تحریروں کو کاٹ پیٹ کرنے میں بڑا لطف آتا ہے، مگر دوسروں کے مسودے کاٹنے پیٹنے میں بار خاطر محسوس کرتے، صرف اتنا کہہ کر واپس کر دیتے کہ زبان ٹھیک نہیں ہے' مواد کی کمی کی وجہ سے ہلکا ہے' اتنا کہہ دینا کافی ہوتا.

مولانا عبدالسلام ندوی کو شگفتہ اور فصیح زبان لکھنے میں بڑی قدرت تھی، مگر وہ دوسروں کی زبان درست کرنے سے گریز کرتے، صاف کہہ دیتے کہ یہ کام ان سے نہ ہوگا، دارالمصنفین میں یہ کام صرف شاہ صاحب انجام دیتے، ان کو زبان درست کرنے کا بڑا ملکہ تھا، بلکہ فطری ذوق تھا، خود بہت اچھی، سلیس اور رواں زبان لکھتے، دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے، کسی کی بھی تحریر ہوتی، اگر ان کے ذوق کے مطابق نہ ہوتی تو ان کا قلم ضرور چل جاتا، وہ اس کو گوارا نہ کرتے کہ تحریر میں زبان اچھی نہ ہو، میں دارالمصنفین آیا تو ان کے اس وصف سے پورا فائدہ اٹھایا۔ معارف کے لئے کوئی بھی تحریر لکھتا تو ان کو ضرور دکھاتا،

شروع میں تو میں دارالمصنفین کی صحبت میں بے تکلف نہیں رہا، لیکن رفتہ رفتہ یہاں کے لوگوں سے قریب تر ہوتا گیا، کھانے، ناشتے اور سہ پہر کی چائے کی اجتماعی صحبت جاری تھی، سید صاحبؒ کی اصلی علمی مجلس عموماً سہ پہر کی چائے پر ہوتی، ان کے انداز بیان میں کچھ ایسی نکتہ آفرینی اور دیدہ وری ہوتی کہ اس سے بڑی علمی بصیرت حاصل ہوتی رہتی، ان کی گفتگو کی جیسی لذت کسی اور علمی مجلس میں نہیں ملی، بڑے بڑے علماء اور فضلاء کی گفتگو سنی، مگر ان کی باتوں سے جس طرح لذت آشنا ہوتا رہا، کسی اور سے نہیں ہوا، خدا جانے علم کی کتنی گتھیاں ان کی باتوں سے کھلتی اور سلجھتی رہیں،

اس مجلس سے اٹھنے کے بعد پھر بڑی بے تکلفی رہتی، عزیز صاحب، شاہ صاحب اور نیاز احمد صدیقی صاحب دارالمصنفین ہی میں رہتے، بشیر احمد صدیقی صاحب تقریباً روزانہ شام کو آجاتے، مولانا عزیز الرحمن شبلی اسکول میں ہیڈ مولوی تھے، کانپور سے فاضل الٰہیات تھے، وہ بھی ہفتے میں کئی بار دارالمصنفین آجاتے، یادش بخیر جناب حاجی عبدالغفور رختہ شہر میں ہوتے تو صبح کے ناشتے میں ضرور شریک ہوتے رہتے، پھر شام کو بھی کبھی آجاتے، بالکل ان پڑھ تھے، لیکن جناب نیاز احمد صدیقی نے اپنی تفریحی باتوں سے ان کو شاعر بنا دیا، ان کا کوئی مصرعہ یا شعر درست نہ ہوتا، مگر ان کو اپنی تک بندی سے اتنی غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ دارالمصنفین کے معزز مہمانوں کے سامنے بھی اپنا راگ ضرور الاپتے، اور داد کے طلبگار ہوتے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے

جناب رشید احمد صدیقی دارالمصنفین آئے تو حاجی صاحب نے ان کو اپنا پورا کلام سنایا، رشید صاحب کو اپنے طنز و مزاح کے لیے ایک اچھا موضوع مل گیا، اور ان پر ایک مضمون لکھنے کو تو لکھ گئے، مگر حاجی صاحب کے لیے ان ہی کی رائے کے مطابق یہ سند ان کو زندۂ جاوید بنانے میں کام آگئی، آخر میں وہ اس کے بھی متوقع رہے کہ جب ان کے کلام کا مجموعہ شایع ہوگا تو حضرت سید صاحبؒ نے جس طرح جگر مرادآبادی پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اسی طرح ان پر بھی ایک عمدہ تحریر لکھیں گے، حاجی صاحب شاہ صاحب کی بھی مجلسوں میں برابر شریک رہتے، آخر وقت تک صبح کا ناشتہ ان ہی کے ساتھ کرتے رہے،

ارکانِ صحبت | سن کے اعتبار سے بشیر احمد صدیقی صاحب سب سے بڑے تھے، نیاز احمد صدیقی صاحب اور عزیز صاحب ہمسن تھے، سب سے چھوٹے شاہ صاحب تھے، مگر میر مجلس وہی ہوجاتے، بشیر احمد صدیقی صاحب شبلی اسکول کے بہت ہی کامیاب ہیڈ ماسٹر تھے، ان کی متشرع داڑھی ان کے گورے اور روشن چہرے پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی، بڑے مجلسی آدمی تھے، آواز اچھی تھی، کبھی کبھی گایا بھی کرتے، شہر کے حکام سے تعلق پیدا کرنے میں بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے، اسکول میں ان کی وجہ سے گورنر تک مدعو ہوئے، جس سے اسکول کی مقامی شہرت بڑھتی گئی، ان کی مساعیٔ جمیلہ سے یہ اسکول ڈگری کالج ہوگیا، یہاں سے وہ پاکستان چلے گئے، کراچی میں محکمۂ تعلیم میں اچھے اچھے عہدوں پر رہ کر ریٹائر ہوئے تو کئی ڈگری کالجوں کو چلاتے رہے، دسمبر ۱۹۷۵ء میں کراچی میں وفات پائی،

نیاز احمد صدیقی صاحب کی فروتنی، خدمت گذاری اور خاکساری سے سب ہی متاثر تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی لوگوں کو خیال ہوجاتا کہ بعض صحابۂ کرام بھی ایسے ہی رہے ہوں گے، ان کی اصابتِ رائے کے سب ہی قائل تھے، وہ شبلی کالج سے جونپور محمد حسن انٹر کالج کے پرنسپل ہوکر چلے گئے تھے، اللہ کے فضل و کرم سے ابھی تک بقید حیات ہیں، اب اپنے گھر مڑیاہو ہی پر پنشن پاکر زندگی بسر کر رہے ہیں، عزیز صاحب اپنی سنجیدگی کے لیے پسند کیے جاتے، بہت جنچی تلی باتیں کرتے، دارالمصنفین میں آٹھ سال رہ کر مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو

میں لکچرار ہوکر چلے گئے، وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد کراچی چلے گئے، وہ فضل الٰہی سے اب تک بقید حیات ہیں ان کی تاریخ دولت عثمانیہ دارالمصنفین کی مقبول کتابوں میں ہے، مسلم یونیورسٹی میں رہ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی، ان کے مقالہ کا عنوان تھا اردو زبان میں غیر مسلم مذاہب کے لٹریچر، مولوی عزیز الرحمٰن شاہ صاحبؒ کی آخر زندگی تک یہاں آتے رہے، اور جب ان کی حرکتِ قلب بند ہونے سے وفات ہوئی تو وہ اس وقت ان ہی کے پاس موجود تھے، اور ان ہی کی گود میں اللہ کو پیارے ہوئے، یہ تمام حضرات دارالمصنفین کی شام کی مجلس میں شریک ہوجاتے تو پھر بڑی دلچسپی رہتی، شاہ صاحب اس نجی مجلس میں اپنے قہقہوں سے جان پیدا کیے چھائے رہتے، گفتگو زیادہ تر دوسرے کرتے، وہ صرف داد دیتے جس سے اندازہ کچھ ایسا ہوتا کہ اسی کی خاطر ان کے پاس لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے، اس میں علمی گفتگو کم ہوتی، زیادہ تر تفریحی رنگ ہوتا، جس سے دن بھر کے علمی کام کے بعد تازگی پیدا ہوجاتی، سیاست پر بھی گفتگو چل نکلتی، اخبار کی تازہ خبروں کے ساتھ گاندھی جی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مونجے وغیرہ سب ہی موضوع بن جاتے، پنڈت جواہر لال کی محبوبیت پر ہم سب متفق تھے، اس وقت ان کا طوطی بولتا تھا، تمام مسلمانوں کو ان کی مخلصانہ سیاست پر اعتماد کلی تھا، اس زمانہ میں ہم میں سے کسی کو بھی خیال نہ تھا کہ سیاست کا رخ کچھ ایسا بدل جائیگا کہ تقسیم ہند ناگزیر ہوجائے گی، مولانا عبدالسلام ندوی کو ان مجلسوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی، وہ خالی اوقات میں شہر کے بازاروں، چوراہوں اور گلیوں میں دکھائی دیتے، جو ان کی نظروں میں خوب سے خوب تر تھیں، وہ جب کبھی ان مجلسوں میں شریک ہوجاتے تو اپنی گلگشت متانہ ہی کی روداد سناتے، جس کو سن کر مجلس زعفران زار ہوجاتی، ان مجلسوں میں شاہ صاحبؒ ہی کا حکم چلتا، کوئی موضوع طویل ہوجاتا تو اپنی پاٹ دار آواز سے اس کو روک دیتے اور سب اس حکم کی تعمیل کرتے، اس سے ان کی محبوبیت کا اندازہ ہوتا، شاہ صاحبؒ نیاز احمد صدیقی صاحب کو بہت عزیز رکھتے، دونوں سولہ[16] سال تک ایک ساتھ

رہے، نیاز صاحب بھی ان کی بڑی عزت کرتے، سید صاحبؒ کی وفات کے بعد وہ شاہ صاحبؒ سے عظیم تر کسی اور کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس صحبت میں منگل اور جمعہ کو شہر کے ممتاز طبیب حکیم محمد آسحٰق صاحب بھی شریک ہوتے، اس بے تکلف مجلس میں مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی بھولے بھٹکے شریک ہوتے، وہ سید صاحبؒ کے سگے بھتیجے تھے، ان کے والد بزرگوار حکیم مولوی سید ابو حبیب صاحب بڑے ہی عابد اور زاہد بزرگ تھے، مجددیہ سلسلہ میں حضرت مولانا ابو احمد بھوپالی سے بیعت تھے، ان ہی سے روحانی تربیت پاتے رہے، سید صاحب سے اٹھارہ سال بڑے تھے، مولانا ابوظفر صاحب نے ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی، مولانا عبد الباری ندوی ان کے ہم درس رہے، ان کی ملازمتوں کی داستان بڑی طویل ہے، ندوہ سے فارغ ہوکر کچھ دنوں ملتان میں رہے، پھر رنگون جاکر ایک عربی مدرسہ میں مدرس ہوگئے، وہاں برمی زبان سیکھی، برمی بول چال کے نام سے ایک کتاب لکھی، اپنا سفرنامہ برما بھی مرتب کیا، رنگون سے احمد آباد چلے آئے، جہاں گاندھی جی کے قائم کردہ کالج مہاودیالیہ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، وہاں بڑی محنت سے تاریخ گجرات لکھی جو بعد میں ۱۹۵۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شایع ہوئی، ان ہی دنوں انھوں نے مرآۃ احمدی کا ترجمہ تاریخ اولیائے گجرات کے نام سے کیا، یہ ۱۹۳۲ء میں احمد آباد سے شایع ہوئی، احمد آباد سے مدراس چلے آئے تو وہ سیٹھ جمال کے جمالیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، وہاں سے جناب نواب علی وزیر تعلیم ریاست جوناگڈھ نے ان کو جوناگڈھ بلالیا، جہاں ان سے علمی و مذہبی کام لیے گئے، یہاں کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے اردو کے مشہور اہل قلم اختر جوناگڈھی کے ساتھ مل کر ایک علمی رسالہ بھی شہاب کے نام سے نکالا، احمد آباد اور جوناگڈھ میں رہنے کی وجہ سے ان کو بوہروں کی تاریخ سے دلچسپی ہوئی تو بوہروں کے بعض اکابر کی فرمایش پر ان کی ایک تاریخ لکھی، جب یہ چھپ کر تیار ہوئی تو بوہروں کے کچھ فرقوں کو اس کے بعض حصوں پر اعتراض ہوا، اس لیے اس کی اشاعت روک دی گئی، وہاں سے دارالمصنفین آئے، تاریخ سندھ لکھنے کے لیے خاص طور پر بلائے گئے، مگر وہ اس شرط پر آئے کہ

ان کو دارالمصنفین کے احاطہ میں رہنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، وہ ندوہ میں مولانا مسعود علی ندوی سے اوپر درجہ میں تھے، مولانا مسعود علی کا احترام اس احاطہ میں جس طرح کیا جاتا، وہ ان کے اقتضائے طبیعت کے خلاف تھا۔ اس لیے وہ شہر میں ایک مکان لے کر رہنے لگے، وقت پر کتب خانہ آتے اور وقت پر چلے جاتے، مولانا مسعود علی ندوی سے ملنا پسند نہ کرتے، شکل وجیہ پائی تھی، لباس بھی اچھا پہنتے، زلفیں رکھتے، ٹوپی گول پہنتے، مولانا مسعود علی ان کو تفریحاً شہزادہ تاج الملوک کہا کرتے، مگر وہ مولانا مسعود علی کو لائق التفات نہ سمجھتے، جب دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا تو ہم لوگوں کو ڈر لگا رہتا کہ دونوں میں اَن بَن نہ ہو جائے، مگر وہ شاہ صاحبؒ کے اخلاق کے معترف رہے، ان کی تحریروں کی ادبی شان کے مداح تھے، کہتے کہ ان سے تاریخ لکھانے کے بجائے ادبی کتابیں لکھانی چاہیے تھیں، جس محنت اور ریاضت سے وہ اپنی علمی چیزوں کو تیار کرتے، اس کے معترف شاہ صاحبؒ بھی رہے، کہتے کہ ان کے جسم کو کھرچیے تو اس سے ہندوستان کی تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو کی صدا نکلے گی، دارالمصنفین کے قیام میں تاریخ سندھ لکھی جو چھپ کر بہت مقبول ہوئی، معارف میں حسب ذیل مضامین بھی لکھے: (۱) ہندوستان میں توپ کا استعمال (۲) ہندوستان کے کتب خانے، (۳) ہندوستان میں کاغذ سازی (۴) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ڈاک کا انتظام، وہ کچھ دنوں کے بعد دارالمصنفین سے شانتی نکیتن چلے گئے، وہاں سے پھر اینگلو ورنیکولر سوسائٹی احمد آباد آگئے، جہاں رہ کر گجرات کی تمدنی تاریخ لکھی، جو دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے، ۱۹۵۸ء میں وفات پائی، شاہ صاحبؒ نے جولائی ۱۹۵۸ء کے معارف میں ان پر جو شذرات لکھے، اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

"افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہماری جماعت کے ایک نامور رکن مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے انتقال کیا، ان سے دارالمصنفین کے گوناگوں تعلقات تھے، وہ ندوہ کے مشہور فاضل، نامور اہل قلم اور حضرت سید صاحب کے حقیقی بھتیجے تھے، دارالمصنفین میں کئی سال تک رہے تھے، ان کی پوری زندگی علم و تعلیم کی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گذری۔ ۔ ۔ ۔ علمی کمالات کے ساتھ بڑے دیندار، نیک نفس اور

سادہ مزاج تھے، علمی کاموں کے ساتھ کچھ نہ کچھ دینی و ملی کام بھی کرتے رہتے تھے، حضرت سید صاحبؒ کے گھرانے میں وہ آخری علمی یادگار تھے، وفات کے وقت ستر سال کے قریب عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس خادم علم و دین کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔"

راقم دارالمصنفین آنے کو تو آگیا، مگر یہاں ابھی پورے طور پر جم نہ سکا تھا، ایم۔ اے کرنے کی فکر تھی ۱۹۳۵ء کے اکتوبر میں شادی بھی ہونے والی تھی، اس لیے پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ نہ دے سکا، میرے منجھلے چچا جناب سید قطب الدین صاحب مجھ کو اپنا فرزند سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے بڑے حوصلہ کے ساتھ یہ شادی انجام دی اور خرچ کا کوئی خیال نہیں کیا، اس میں شرکت کے لیے سید صاحب اپنے اہل و عیال کے ساتھ دیسنہ آئے، خیال تھا کہ دارالمصنفین کے اور لوگ بھی شرکت کریں گے، مگر صرف مولانا مسعود علی ندوی پہونچے، میں ان کا بیحد ممنون ہوا، شاہ صاحب اور عزیز صاحب بعض اسباب کی بنا پر نہ پہونچ سکے، دارالمصنفین میں میرے آنے کے کچھ ہی دنوں بعد یہ شادی ہوئی تھی، اس لیے ان لوگوں سے ابھی بہت قریب نہیں ہوا تھا، مولانا مسعود علی ندوی سید صاحبؒ کے وطن کی کشش کی وجہ سے بھی وہاں تشریف لائے، وہ پہونچے تو بلبل ہزار داستان بنے رہے، میرے ہم وطن اور اعزہ ان کی پُر لطف باتوں سے بہت محظوظ ہوئے، وہ بہار کی شادی کے رسم و رواج، گیت، راگ، ہاتھی، گھوڑے، لاؤ لشکر، باراتیوں کے ہجوم، جہیز میں سونے چاندی کے سامان کی فراوانی دیکھ کر متاثر ہوئے، دیسنہ کے ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو اس بیجا اسراف پر بہت ہی دلچسپ انداز میں نکتہ چینیاں کیں، جو وہاں کے لوگوں کو پسند آئیں، وہاں سے رخصت ہوئے تو میرے اعزہ نے چاندی کے ظروف میں کھانے پینے کی بہت کچھ چیزیں ساتھ کر دیں، اعظم گڈھ واپس آکر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں شادی کا ذکر کرتے رہے، کہتے کہ ان کو تو معلوم ہوتا رہا کہ وہ جہانگیر آباد کے راجہ کے یہاں کی تقریب میں شرکت کر رہے ہیں، شاہ صاحبؒ کو برابر افسوس رہا کہ وہ اس میں شریک نہ ہو سکے، جب وہ حیات سلیمان لکھ رہے تھے تو سید صاحبؒ کے وطن کا ذکر لکھتے وقت بار بار کہتے کہ

وہ میری شادی میں شریک ہو جاتے تو اس گاؤں کا ذکر کرنے میں ان کا قلم خوب چلتا۔

مولانا مسعود علی ندوی کا دبدبہ

اس زمانہ میں دارالمصنفین کے اندر مولانا مسعود علی ندوی ہی کا طوطی بول رہا تھا، وہ تہجد کیلیے اٹھ جاتے، پھر کچھ وظائف پڑھ کر مسجد میں فجر کی نماز ادا کرتے، تھوڑی دیر تلاوت کلام پاک میں مشغول رہتے، اشراق پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتے، کچھ دور ٹہلنے کے لیے جاتے، واپس آکر ناشتہ میں شریک ہوتے پھر چاشت کی نماز پڑھتے، اس کے بعد دس بجے دن تک تلاوت کلام پاک کرتے، اس سے فارغ ہو کر مطبخ بالا ہو جاتے اور اپنا دربار عام کرتے، شہر کے کچھ لوگ آجاتے، پھر ان کی گل فشانیاں شروع ہو جاتیں، پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کے ساتھ ترک موالات کی تحریک میں کام کر چکے تھے، اس لیے ان دونوں کے نام ان کی نوک زبان ہوتے، بلا ناغہ اپنی مجلسوں میں ان کا ذکر کسی نہ کسی طرح لے آتے، ایک ہی بات کو طرح طرح سے ادا کرتے، سامعین روزانہ اسی بات کو سنتے، مگر ان کے بیان کرنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ ان کی باتوں میں باسی پن محسوس نہ ہوتا، ان کو فن تعمیر میں بڑا فطری ملکہ تھا، دارالمصنفین کی ساری عمارتیں ان ہی کی نفاست ذوق کی شاہد ہیں، اور یہی ان کی تصانیف ہیں، رہنے سہنے میں بھی ان کی خوش سلیقگی ظاہر ہوتی رہتی، دعوتوں کا بڑا اچھا انتظام کرتے، دارالمصنفین کے اندر بات بات پر دعوت کراتے رہتے، وہ ۱۹۱۴ء میں اعظم گڈھ آئے تھے، اس وقت اس قصبہ کا معیار زندگی کچھ اونچا نہ تھا، اس لیے لوگ ان کی خوش سلیقگی سے متاثر ہو کر اعتراف کرتے رہے کہ ان ہی نے یہاں کے لوگوں کو رہنا سہنا سکھایا، اسی لیے ایک عرصہ تک شہر کے بے تاج بادشاہ بھی بنے رہے، جب شہر میں نکلتے تو کچھ لوگ ان کے آگے پیچھے ضرور رہتے، رمضان شریف میں ایک ایک روز اپنے مخصوص ملنے والوں کے یہاں افطار کی دعوت کراتے، اس طرح پورا مہینہ دعوتوں میں گذر جاتا، جہاں بیٹھ جاتے اپنی باتوں سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے، ان کے مقابلہ میں کوئی بول نہیں سکتا تھا، اگر کوئی دم مار سکتا تھا تو وہ شاہ صاحب ہی تھے، جو بیچ میں کوئی نہ کوئی پھڑکتا ہوا جملہ کہہ دیتے، جس سے مولانا کبھی تو خوش، کبھی لاجواب اور کبھی جز بز ہو جاتے، مگر شاہ صاحب کا طرز ادا کچھ ایسا

خوشگوار ہوتا کہ دوسرے لوگوں کے لیے ہنس دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔

مولوی صاحب نے شہر میں اپنے ملنے والوں کا اچھا حلقہ بنا لیا تھا، اس زمانہ میں جتنی معزز شخصیتیں تھیں اُن سب سے ان کے تعلقات تھے، ان میں سب سے مخلص ترین جناب مرزا احسان احمد صاحب تھے ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، ان کے بڑے بھائی مرزا سلطان احمد اس وقت یو۔پی کے سول سروس کے بڑے محبوب اور ممتاز عہدیدار تھے، مختلف اضلاع میں کلکٹر کے عہدہ پر رہ کر آخر میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے، پنشن پاکر اعظم گڈھ آئے تو ہر شخص ان کا گرویدہ رہا، ان کا دل گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح تھا، ان کی باتیں قلاقند سے بھی زیادہ شیریں ہوتیں، مولوی مسعود علی اور دارالمصنفین کے تمام لوگوں سے بہت ہی قریب تر رہے، مولوی مسعود علی صاحب کے بے تکلف ملنے والوں میں شاہ محمد صابر صاحب بھی تھے جو اس وقت کے چیف جسٹس سر محمد اقبال کے بہنوئی تھے، میونسپلٹی کے انتخاب میں ان کا نمایاں حصہ ہوتا، عین وقت پر انتخاب کا رخ بدل دیتے، مولوی صاحب خود کبھی اس انتخاب میں کھڑے نہیں ہوئے، لیکن شبلی منزل ہی میں بیٹھ کر ان کے ساتھ انتخاب لڑاتے رہے۔

مرزا مرتضیٰ بیگ شہر کے ممتاز ترین وکلاء میں تھے، ان کی قانونی لیاقت اور وضعداری مشہور تھی، سیاسی رائے میں مولوی صاحب سے اختلاف کرتے رہتے، مگر دارالمصنفین کے بڑے قدردان رہے، کہتے کہ شہر کے لوگوں نے رہنے سہنے کا سلیقہ شبلی منزل ہی سے سیکھا، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی ہوئے، آخر وقت میں پاکستان چلے گئے تھے، جہاں ۱۹۷۵ء میں وفات پائی۔

شاہ علاء الحق بھی شہر کے ممتاز وکیل تھے، لباس، وضع قطع، رہنے سہنے میں نفاست کے دلدادہ تھے، آخر وقت تک مولوی صاحب اور دارالمصنفین سے بڑا تعلق رکھا، وہ بھی پاکستان چلے گئے تھے، اور ۱۹۷۵ء ہی میں وفات پائی۔

جناب محمد ظہور صاحب شہر کے بڑے اچھے مختار تھے، اپنی وضعداری اور شرافتِ اخلاق کے لیے مشہور رہے، وہ ہر اتوار کو شبلی منزل ضرور آتے، اور ہفتہ بھر کے اخبارات کا مطالعہ کرتے۔

امین الدین صاحب مولوی مسعود علی صاحب سے سن میں بہت چھوٹے تھے، اس زمانہ میں وکالت کرتے تھے، بڑی اچھی تفریحی گفتگو کرتے، اس لیے مولوی مسعود علی اور دارالمصنفین کی صحبت کے اہم رکن رہے، ابھی تک بقیدِ حیات ہیں، ریونیو افسر ہوگئے تو وکالت چھوڑ دی، پھر شبلی کالج میں قانون کے پروفیسر ہوگئے، وہیں سے ریٹائر ہوئے، ان کے داماد لندن میں ہیں اس لیے وہاں کئی بار گئے، ان کے چھوٹے بھائی معین الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر ہوئے تو کوآپریٹیو سوسائٹی کے ڈپٹی رجسٹرار ہوکر ریٹائر ہوئے، وہ بھی مولوی مسعود علی کے مخلص ملنے والوں میں رہے، یہ دونوں بھائی دارالمصنفین سے اپنے پرانے تعلقات کی وضعداری کو پورے اخلاص سے نباہ رہے ہیں،

یہ حضرات شبلی منزل میں جمع ہوجاتے تو پھر دیر تک بارونق مجلس رہتی، جو پرانی تہذیب کی بھی یاد تازہ کرتی، جناب اقبال سہیل اعظم گڈھ میں گو وکالت کرتے، مگر اس پیشہ کے باوجود ان کی شاعری میں رفعت پیدا ہوئی، ہندوستان کے ممتاز ترین شعراء میں ان کا شمار ہوتا، گو وہ اپنے اس بلند رتبہ سے بے نیاز رہے، وہ اپنے علمی ادبی ذوق کی وجہ سے مولوی مسعود علی صاحب سے زیادہ حضرت سید صاحبؒ سے قریب تر رہے، وہ شبلی منزل آجاتے تو پھر یہاں کی مجلس شعر و ادب کی محفل بن جاتی جس میں سید صاحب کی موجودگی کی وجہ سے بڑی باوقار شائستگی پیدا ہوجاتی، ان مجلسوں کا ذکر نوکِ قلم پر اس لیے آرہا ہے کہ ان سے مقامی حیثیت سے دارالمصنفین ایک خاص تہذیبی مرکز بھی بن گیا تھا، شاہ صاحبؒ ان مجلسوں میں برابر شریک رہتے، جس سے ان کی تہذیبی شخصیت کے ابھرنے میں مدد ملی، ان کو اپنے گھر اور خاندان سے بھی تہذیبی وراثت ملی تھی، دارالمصنفین کی مجلسوں میں اور جلا پیدا ہوتی گئی،

شاہ صاحبؒ کی صاف ستھری زندگی

جنوری ۱۹۳۵ء میں میری شرکت دارالمصنفین میں ہوئی تو شاہ صاحبؒ گیارہ برس کے بعد ترقی کرکے پچاس روپے تک پہونچے تھے، اس وظیفہ میں بڑی اچھی زندگی بسر کرتے،

ان کی ننہالی اور دادھیالی جائداد سے اچھی خاصی سالانہ آمدنی ہوجاتی تھی، دو باغ تھے، مکانات کے کرایے بھی مل جاتے، جائداد سے ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی بھی ہوجاتی، جب تک ان کے والدین زندہ رہے اس آمدنی سے کچھ بھی نہیں لیتے، والدین کی وفات کے بعد مذکورۂ بالا آمدنی ان کے چھوٹے بھائی لیتے رہے، شاہ صاحبؒ اپنے اخراجات کے لیے دارالمصنفین میں جو کچھ پاتے اس کو کافی سمجھتے، ان کے پاس ایک ملازم محمد نصیر نامی بھی تھا اس کو ماہانہ تنخواہ دینے کے علاوہ سال بھر کے کپڑے بھی دیتے اور اپنے ہی اخراجات سے اس کو ساتھ گھر بھی لے جاتے وظیفہ میں سے کچھ بچا کر اپنی اہلیہ کو بھی ماہانہ خرچ بھیجتے رہتے۔ روزمرہ کی زندگی میں اچھا پہنتے اور اچھا کھاتے، بہت صاف کپڑے پہنتے، ہر تیسرے دن کپڑے اہتمام سے بدل دیتے، کبھی ان کے جسم پر میلے کپڑے نہیں دیکھے گئے، گرمیوں میں تن زیب کے کرتے پہنتے، جن کو پھٹنے سے پہلے اپنے ملازم کو دے دیتے، جاڑوں میں ذرا موٹے کپڑے کے کرتے بنواتے، پورا سرمائی سامان رکھتے، بہت اچھے درزی کی سلی ہوئی شیروانی پہنا کرتے، دارالمصنفین کے لوگوں کے لیے جو بال بچوں کے ساتھ نہیں رہتے، ایک علحدہ باورچی خانہ تھا، جس میں طرح طرح کے کھانے شاہ صاحب کے حکم سے پکتے، ملے جلے دسترخوان پر اس باورچی خانہ سے کھانا آتا تو دسترخوان بھر جاتا، دو تین مہمان اچانک آجاتے تو دسترخوان پر کھانے کی کمی نہ ہوتی، شاہ صاحب میٹھی چیزیں بہت پسند کرتے، اس لیے اس زمانہ میں میٹھی چیزیں برابر پکا کرتی تھیں، وہ اپنے گھر سے بھی دیسی گھی اور بھیلی ضرور رکھتے، دونوں کو ملادیتے تو کہتے کہ اس سے بہتر حلوہ بھی نہیں ہوسکتا ہے۔

ان کی دوسری اہلیہ جب تک زندہ رہیں، اعظم گڈھ سے ہر چھٹے مہینے رُدولی جاتے، جاتے وقت ان پر ایک خاص قسم کا نشاط رہتا، چہکتے رہتے، واپسی کے بعد کئی روز تک افسردہ اور پژمردہ رہتے، مجلس کی باتوں سے دلچسپی نہ لیتے۔

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام "سرودِ زندگی" پر شاہ صاحب کا مضمون

ستمبر اور اکتوبر ۱۹۳۵ء کے معارف میں شاہ صاحبؒ نے اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام "سرودِ زندگی" پر جو ناقدانہ مضمون لکھا اس کی داد ان کو ادبی حلقہ سے

بہت ملی، اس وقت اصغر گونڈوی کی شاعری اپنے پورے عروج پر تھی، ان کا نام فانی، جگر اور حسرت کے ساتھ لیا جاتا، یہ چاروں اس وقت کی غزل گوئی کے عناصر اربعہ بنے ہوئے تھے، فانی یاسیات کے امام سمجھے جاتے، موت کو اپنی غزل میں خنجر کی آڑ میں ادا سے منھ چھپاتی ہوئی دلھن بنا کر پیش کر رہے تھے، انھوں نے موت کو جو چمکار اور پیار دیا اس سے اردو غزل گوئی کے ذریعہ سے غم کی دکھتی ہوئی رگوں کو اپنی چٹکیوں اور گدگدیوں سے ملنے، ان سے طبیعت میں گداز، نظر میں بصیرت اور احساس میں گہرائی پیدا کرنے کا درس ملا، انھوں نے ہم کو یہ بھی سکھایا کہ زندگی کب موت اور موت کب زندگی ہوتی ہے، جگر کی شاعری میں کوئی نیا موضوع تو نہیں لیکن ان کے یہاں جو روحانی دردمندی، والہانہ گم شدگی اور مدہوشانہ ربودگی ہے، وہ اردو غزل گوئی کے لیے اس زمانہ میں ایک نیا عنوان تھا، حسرت کی غزلوں میں بھی فکر کی گہرائی نہیں مگر ان کا دل ربایانہ اور دلبرانہ انداز کچھ ایسا ہے کہ ان کو پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ جذبات میں ہلچل پیدا کر رہے ہیں، اور جانی بوجھی چیزوں کو رسیلا پن اور بانکپن دے رہے ہیں، اصغر کے یہاں حسن تخیل کے ساتھ ذوق عرفان اور علم و حکمت کی جو خوش نوائی اور زمزمہ سنجی ہے اس سے اردو کی غزل گوئی میں پُر کیف وزن اور وقار پیدا ہوا۔

یہ بات اعظم گڈھ کی ادبی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے کہ جگر اور اصغر دونوں کے کمالات کو اجاگر کرنے میں اعظم گڈھ ہی کے ارباب نظر کا حصہ ہے، اصغر کا مجموعۂ کلام نشاط روح شایع ہوا تو مرزا احسان احمد بیگ اور جناب اقبال سہیل نے اس پر جو مقدمے لکھے ان سے اصغر کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مدد ملی، دونوں بلند پایہ شاعر بھی تھے، اس لیے وہ شاعرانہ رموز و نکات کے ادا شناس بھی ہے اس لیے اصغر کی شاعری کو وہی پرکھ سکتے تھے، اقبال سہیل اصغر کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے کہ جناب اصغر کی شاعری عام سطح سے بہت بلند ہے، ان کے یہاں ڈوبی ہوئی نبض، پتھرائی ہوئی آنکھیں اور عالم نزع کی ہچکیاں، غرضکہ زندہ در گور شعراء کی بدمذاقیاں کہیں بھی نہیں ہیں،

ان کی شاعری رقصِ معانی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے، آنسو کا ایک ناچیز قطرہ ان کے جوشِ طبیعت کے فیض سے کبھی ستارۂ سحری بن کر چمک اٹھتا ہے اور کبھی شوق کا بحرِ کنار بن جاتا ہے۔"

پھر مرزا احسان احمد نے ان کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"ان کی نگاہ میں صرف اسی عالم قدس کے روح پرور مناظر کی ادا شناس ہیں جہاں ایک لازوال تاثر، ایک روح نواز ترنم، ایک ابدی لذت، ایک جان فروز تجلی، ایک نشاط آفریں رقص، ایک دلگداز ذوق، ایک آتش فشاں وجد کے سوا کوئی سماں نظر نہیں آتا، اس لیے موجودہ مذاق اور عالم مادی کے حوادث و افکار کی مرقع نگاری کے دلدادہ ممکن ہے کہ حضرت اصغر کی اس لغزشِ مستانہ کے خیر مقدم کے لیے تیار نہ ہوں، لیکن ذوقِ لطیفِ عشق و محبت کے ان اسرار و رنگیں پر جو درحقیقت صحیفۂ شاعری کے ابدی نقوش ہیں بغیر وجد کیے ہوئے نہیں رہ سکتا۔"

شاہ صاحب ان دونوں بزرگوں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، مگر جب انھوں نے اصغر صاحب کی شاعری پر لکھنا شروع کیا تو ان دونوں کی صف میں کھڑے نظر آئے، اصغر صاحب نے مجموعۂ کلام 'نشاطِ روح' کے بعد دوسرا مجموعہ 'سرودِ زندگی' کے نام سے شایع کیا، شروع میں انھوں نے خود ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے' جو بقول شاہ صاحب ان کے علوئے نظر اور بلند نظری کا آئینہ دار تھا، اس کے بعد سر تیج بہادر سپرو کا یک مقدمہ تھا جو فارسی اور اردو زبان کے رچے ہوئے ذوق کی وجہ سے اس زمانہ میں علمی حلقہ میں بھی مشہور تھے، آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک مختصر تقریظ تھی، جس شاعر کو سر تیج بہادر سپرو اور مولانا ابوالکلام آزاد پسند کریں' ظاہر ہے کہ پھر اس کے نہ صرف باکمال بلکہ باوقار ہونے میں کسی کو شبہہ ہو سکتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اصغر نے اپنے وقار کو قائم رکھ کر جس طرح اپنی شاعری کو باوقار بنایا' وہ ان کے ہمعصروں کو نصیب نہیں تھا، باوقار شاعر پر لکھنے کے لیے جو باوقار انداز ہونا چاہیے وہی شاہ صاحبؒ نے اصغر صاحب کی شاعری پر لکھنے کے لیے اختیار کیا، اپنے مضمون کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

"حضرت اصغر اور ان کی شاعری باذاق اور سخن فہم میں بیگانہ نہیں، وہ دورِ جدید کے ان شاہکارانِ سخن میں ہیں جنھوں نے لیلائے تغزل کے بکھرے ہوئے گیسوؤں کو سنوارا ہے' اور اس کے دلفریب جمال کو جس کا پرانا دقیانوسی سامانِ زینت جمالِ شاعری کے ساتھ اربابِ نظر کی نگاہوں کو بھی مجروح کر رہا تھا جدید طرز سے آراستہ اور نئے آب و رنگ سے نکھار کر اربابِ نظر کی محفل میں آنے کے قابل بنایا۔"

اس کے بعد مولانا ابوالکلام کی تقریظ پر ان کی رائے ہے، سرودِ زندگی' کی اشاعت سے پہلے مولانا کی اس تقریظ کا ذکر اخباروں اور رسالوں میں آتا رہا، اس کے متعلق شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"سرودِ زندگی پہلا دیوان بلکہ غالباً پہلی کتاب ہے جسے مولانا کی تقریظ کا طرۂ افتخار حاصل ہوا ہے دیوان کی اشاعت سے پہلے مولانا کے "مقدمہ" کی شہرت سن کر اس کے دیکھنے کا حیرت آمیز اشتیاق پیدا ہوا تھا، کہ مولانا کے پُر بہار قلم نے معلوم نہیں کیا کیا گل کاریاں کی ہوں گی اور اردو میں مرحوم بجنوری کے مقدمۂ دیوانِ غالب کے بعد ایک اور معیار قائم ہو جائے گا، لیکن دیوان دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس شہرت کی حیثیت اشتہار سے زیادہ نہ تھی۔"

اس تحریر سے تو اصغر صاحب پر حرف آتا ہے کہ انھوں نے تقریظ کو اس کی اشاعت سے پہلے اشتہاری رنگ دے دیا تھا، مگر شاہ صاحبؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد کی عظمت کو برقرار رکھا ہے، ان کی تقریباً پوری تقریظ اپنے مضمون میں نقل کر دی اور لکھا:

"مولانا نے حسبِ معمول اس معاملہ میں اپنی انفرادیت اور امتیازی شان قائم رکھی ہے، تقریظ نگاری کے فن سے کس خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں جو ان کا مخصوص کمال ہے، لیکن ان کے قلم سے یہ سندِ تصدیق بھی بہت ہے۔"

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ایک سو دو ۱۰۲ صفحات پر مشتمل تھا، ابتدا میں دو ایک نظمیں تھیں، اس کے بعد غزلیں، پھر تمام غزلیں اور متفرق اشعار تھے، فارسی کا کلام بھی تھا، اس کی ترتیب ردیف وار کے بجائے

زمانی تھی۔

شاہ صاحبؒ اصغر صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام 'نشاط روح' اور اس کے بعد کے مجموعۂ 'سرود زندگی' دونوں کا موازنہ کرتے ہیں، 'نشاط روح' کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان کا پہلا کلام (یعنی نشاط روح) اس دورِ نشاط کے تاثرات کا نتیجہ ہے جب کہ ہر جلوۂ زیبا جنت نگاہ اور ہر نغمۂ رنگیں فردوس گوش اور ہر خیال عشق کا بیان اور حسن کی تفسیر ہوتا ہے، اور فضائے عالم میں ہر طرف رنگینی و مستی چھائی ہوئی نظر آتی ہے، دلولوں اور جذبات میں طوفان کا جوش و خروش ہوتا ہے، اس لیے 'نشاط روح' میں رنگینی و سرمستی، کیف و سرور کا وفور ہے، لیکن اس کی ادنیٰ سطح اور تشنگی اور بار فضا سے بھی شراب حقیقت کے قطرات ٹپکتے نظر آتے ہیں۔"

'سرود زندگی' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"'سرود زندگی' اس عہد کا کلام ہے جب کہ جذبات کا طوفان تھم جاتا ہے، جوش و خروش کی جگہ فکر و تدبر لے لیتے ہیں، نگاہیں ظاہری آب و رنگ سے گذر کر حسن حقیقت کی تلاش میں لگ جاتی ہیں، اس لیے سرود زندگی میں پختگی ہے، گہرائی ہے، فکر و تدبر ہے، بیان حقیقت ہے، اخلاق ہے، فلسفہ ہے، تصوف ہے، غرض اس سرود کے تمام نغمے لاہوتی ہیں، اگرچہ کہیں کہیں مجاز کا رنگین حجاب بھی نظر آتا ہے، لیکن وہ اتنا لطیف اور ہلکا ہے کہ اندر سے حسن حقیقت صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے، لیکن ان تمام محاسن کے باوجود بڑا حصہ جذبات کی بے ساختگی سے خالی ہے، اور خیال آفرینی کا غلبہ ہے۔"

یہ موازنہ شاہ صاحبؒ کے رچے ہوئے تنقیدی اور ادبی ذوق کا ثبوت ہے، جس سے اصغر کے بڑے سے بڑے مداح اور پرستار بھی اختلاف کرنا پسند نہ کریں گے۔

اس کے بعد اصغر صاحب کی شاعری میں جو صوفیانہ رنگ ہے، اس کا تجزیہ شاہ صاحبؒ نے کیا ہے،

شاہ صاحب انکے ذوق عرفان و حقیقت اور فلسفہ و حکمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصغر صاحبؒ کے نزدیک ظاہر پرست مقام حقیقت اور راہ سلوک کے مختلف احوال و کوائف کے متحمل نہیں ہو سکتے، مقام سلوک وہ ہے جہاں خود سالک کا بھی گذر نہیں، اس راہ میں قدم رکھنے کے بعد قیل و قال اور وجد و حال سب ختم ہو جاتے ہیں، اس مقام کے ماجرے راز و نیاز، کفر و ایمان کی سرحد ادراک سے ماورا ہیں، یہاں پہونچ کر قلب و دماغ، خیال و نظر سب پر مطلوب ہی مطلوب چھا جاتا ہے، اور سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں، جمال مطلوب اور خیال مطلوب کے علاوہ خود اپنا ہوش بھی باقی نہیں رہتا، اس عالم بے خودی میں بس ایک سجدۂ شوق کی بے قراری رہ جاتی ہے، سر نیاز اور آستانِ ناز کی بھی خبر نہیں رہتی، جلوۂ بے رنگ کی نمود سے حسن حقیقت کا چہرہ بھی نہیں پہچانا جاتا، لیکن پھر چشم حقیقت نگر تمام حجابوں کو چاک کر ڈالتی ہے اور ساز روح نغمہ سرا ہو جاتا ہے، جن پردوں میں وہ نظر آتا ہے ان کی رنگینی اور تابانی کا عجیب عالم ہوتا ہے، کبھی خود پاک نظر دیکھنے والا احترام حسن میں مجاز کا پردہ ڈال لیتا ہے، مگر جو کچھ وہ دیکھتا ہے وہ سب ظاہری آب و رنگ کا فریب ہے، حقیقت کی کسی کو خبر نہیں، اس بیخبری اور بیہوشی کی وجہ سے ساز اور آواز کی تمیز بھی نہیں رہتی، لیکن اس بے خبری اور بے ہوشی میں بھی ساقی کی محفل دیکھنے والے کچھ باخبر ہیں جو خط ساغر میں حق و باطل کا امتیاز کر لیتے ہیں، دماغی علم و حکمت سے عقدہ کشائی نہیں ہوتی، اس کے لیے میخانۂ دل چاہیے، خرد کے سامنے حجاب عالم ہے، اور نگاہِ عشق بے پردہ دیکھتی ہے، ایمان کی بسیط حقیقت کفر ہے، کیونکہ کفر ہی میں تیور دکھانے سے ایمان بنتا ہے، حرم نشینوں پر سکونِ مطلق طاری ہے اور صنم کدۂ دل میں تجلیوں کی بارش ہے، وغیرہ وغیرہ، شاہ صاحبؒ نے اصغر صاحب کے ان تمام خیالات کو ان ہی کے اشعار سے ثابت کیا ہے، جو شعر و ادب میں ان کی یعنی شاہ صاحبؒ کی بصیرت کی غواصی کی بھی دلیل ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اصغر صاحب کے تغزل کے مجازی رنگ پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے،

لکھتے ہیں کہ اصغر صاحب اس چمن کے بھی ایک خوشنوا نغمہ سرا ہیں، اپنی خوش مذاقی سے انھوں نے ایسے رنگ برنگ کے اور بوقلموں پھول کھلائے ہیں کہ ان کے کلام کا یہ حصہ تختۂ بہار نظر آتا ہے، لیکن اس پر تصوف کا رنگ ایسا چھایا ہوا ہے کہ مجاز و حقیقت میں امتیاز دشوار اور انھیں علحدہ کر کے دکھانا دشوار تر ہے، پھر کچھ کلام کی رنگینی اور کچھ مذاق سلیم کی مدد سے ایک خیالی حد قائم کی جاسکتی ہے، انھوں نے اس رنگ میں اتنا اور ایسا کہا ہے کہ اس سے پوری روداد عشق و محبت مرتب ہو سکتی ہے، جس میں عشق و محبت کی وسعت، ہمہ گیری اور عظمت بھی ملے گی حسن تخیل بھی تمنائے جذبِ شوق بھی، التجائے خلوت بھی، جوشِ تمنا بھی، جذب و عشق کا اثر بھی، التجائے جاں نوازی بھی، مشاہدۂ جمال بھی، نیرنگیِ حسن بھی، تصورِ نظر بھی، ذوقِ بندگی بھی، بہار نقشِ پا پر سجدۂ نیاز بھی، اور انجامِ عشق بھی، ان سب کے ثبوت کے لیے شاہ صاحبؒ نے اپنے حسنِ ذوق سے اصغر صاحب کے اشعار کا بہترین انتخاب کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اصغر کی شاعری میں یہ بھی دکھایا ہے کہ انھوں نے حافظؔ کے اتباع میں حسن و عشق کی کیفیات اور تصوف کے مسائل و کوائف کو موجِ شراب کے پردے میں بھی بیان کیا ہے جسکو خمریات کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، ان کے میخانہ میں وہ تجلی ہے کہ پینے سے زیادہ کھو جانے میں مزا ہے، ان کا میخانہ اسرارِ حقیقت کا عقدہ کشا ہے، ان کی مینائے مے کی نور افشانی کے سامنے آتشِ وادیٔ ایمن بھی چھپ جاتی ہے، ان کے جامِ رنگیں کی تجلی سے زمین سے آسمان تک عالمِ انوار ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک گداز عشق اور سوز غم تغزل کی جان ہے، اس سے روحِ سفری بیدار ہوتی ہے، لیکن سوز و گداز بھی کوائفِ عشق کی ابتدائی کیفیت ہے، اس کا بلند ترین درجہ لذت الم ہے، جب دل درد عشق سے ذوق یاب اور روح جراحت غم سے لذت گیر ہونے لگتی ہے، شاہ صاحبؒ نے

سوز و گداز کی پرانی اصطلاح کے بجائے اس کو لذت الم سے تعبیر کیا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ اصغر صاحب کا دردِ عشق اسی منزل میں ہے، اس کی بہارِ رنگین بھی خزاں کی پروردہ ہے، وہ اشکباری میں بھی مسکرائے جاتے ہیں، لذتِ الم کے لیے خود آپ زخم لیتے ہیں اور درد کے بہانہ سے مطلب کو یاد کرتے ہیں، مستقل غم خود ایک کیفیت بن جاتا ہے، اور درد کی لذت جاتی رہتی ہے، اس لیے وہ تلخیِ غم کو قائم رکھنے کے لیے کبھی کبھی صہبائے خوشگوار بھی چاہتے ہیں، تاکہ درد ان کے لیے متاعِ زیست بن جائے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے اس مضمون میں اردو شاعری پر اس اعتراض کو دہرایا ہے کہ اس میں اخلاقی بلندی کی تعلیم نہیں ہوتی، بلکہ یہ پستی سکھاتی ہے، حالانکہ شاعری تہذیب اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سعدی کے علاوہ کسی نے اصلاحِ اخلاق کو مستقل موضوع نہیں بنایا، اردو کے دورِ جدید کے شعراء میں آزادؔ، حالیؔ، اکبرؔ اور اقبالؔ نے بھی اس کو مستقل موضوع بنالیا، اصغر صاحب اگرچہ کوئی اخلاقی اور مصلح شاعر نہیں ہیں، لیکن ان کا دیوان اخلاقی عناصر سے خالی نہیں ہے، شاہ صاحبؒ نے ان کے مجموعہ میں سے ایسے اشعار نقل کیے ہیں جن میں خودداری، آزادی، حوصلہ کی بلندی کی تعلیم ہے، اور ان کی یہ بھی تلقین ہے کہ کوتاہیٔ عمل گرفتاری اور عافیت کنجِ قفس موت ہے، زندگی خطرات کی زندگی کا نام ہے۔

شاہ صاحب کے اس مضمون کا وہ حصہ بہت اہم ہے جس میں اصغر کی شاعری کی خامیاں دکھائی ہیں، وہ ان کے مجموعۂ نشاط روح کو بلاغتِ ادا کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں، جس میں وہ رنگین نوا شاعر نظر آتے ہیں، اس میں حسن معنیٰ کے ساتھ حسن الفاظ کا ایسا مرقع دکھائی دیتا ہے کہ اس کی غزلیں رنگینیٔ ادا اور دلکشیِ بیان کے لحاظ سے خوش رنگ گلدستہ اور الفاظ کی مرصع کاری کی حیثیت سے عروسِ تغزل کا زیور معلوم ہوتی ہیں، "نشاط روح" کا یہ تجزیہ کر کے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "سرودِ زندگی" میں اصغر صاحب

معلوم نہیں اپنی ان خوبیوں سے اس قدر کیوں بے پرواہ ہوگئے ہیں کہ بعض اشعار میں بیان کی دلکشی تو کجا خیالات بھی مناسب الفاظ میں ادا نہیں ہوسکے ہیں، بیان کی ژولیدگی اور طرز ادا کی خامی کی وجہ سے ان کے بہت سے اشعار نہ صرف حسن ظاہری سے محروم ہوگئے ہیں بلکہ ان کے معنی نکالنا مشکل ہیں۔

شاہ صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کے خیالات رفعت و بلندی اور لطافت و پاکیزگی کی معراج تک پہونچ گئے ہیں، مگر اس پرواز میں ان کا مرغِ خیال کہیں کہیں ایسا بہک جاتا ہے کہ ان کے بعض اشعار بالکل بے معنی ہوجاتے ہیں، اور رعب کاہنوں کی نثر معلوم ہوتے ہیں۔

اسی کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے اصغر صاحبؒ کے اشعار کی بہت سی اور خامیاں دکھائی ہیں، جن کے کچھ نمونے ہم یہاں پر اس لیے نقل کرنا چاہتے ہیں تاکہ موجودہ دور کے نقادوں کو یہ معلوم ہو کہ پہلے تنقیدیں کیسی دیدہ وری سے کی جاتی تھیں، اور اب کسی تنقید میں ایسی وقت نظر دکھائی نہیں دیتی، ذیل میں پہلے اصغر صاحب کے اشعار نقل کیے جائیں گے، پھر شاہ صاحب کی ناقدانہ رائے اختصار کے ساتھ درج کی جائیگی۔

اصغر صاحب: وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب ؎ وہ عینِ زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

شاہ صاحبؒ: اس میں ایک بلند خیال کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن طرز ادا کی خامی نے سارا لطف بے مزہ کردیا ہے، لفظی عیب یہ ہے کہ 'کہتے ہیں جس کو سکون سب' میں نہایت فاحش تنافر حروف ہے، اور 'عین' زائد ہے، معنوی اعتبار سے دونوں مصرعوں کا تقابل صحیح نہیں، یہ اس طرح درست ہوسکتا تھا:

جو زندگی سکون میں گذرے وہ موت ہے ؎ ہے زندگی وہی جو رہے اضطراب میں

اصغر صاحب: ازل میں اک تجلی سے ہوئی تھی بیخودی طاری ؎ تم ہی کو میں نے دیکھا تھا، کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

شاہ صاحبؒ: 'یاد ہوتا ہے' صحیح نہیں، 'یاد آتا ہے' ہونا چاہیے، محض ردیف کی پابندی کی وجہ سے یہ تصرف کیا گیا ہے۔

اصغر صاحب: ہے خرد کی، عشق کی، دونوں کی ہستی پر نظر ؎ یہ شہید نغمہ ہے، وہ مبتلائے ساز ہے

شاہ صاحبؒ: اس شعر سے یہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر خرد اور عشق کی تحقیر کرنا چاہتا ہے، یا عشق کو خرد پر ترجیح دینا چاہتا ہے، یا دونوں کی حقیقت بتانا چاہتا ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی حقیقت سے باخبر کرنا مقصود ہے کہ ایک شہید نغمہ ہے، دوسرا مبتلائے ساز ہے، لیکن 'ہستی پر نظر' سے یہ مطلب واضح نہیں ہوتا ہے، اسے یوں کہنا چاہیے تھا

ہے خرد اور عشق دونوں کی حقیقت پر نظر

اس سے ایک مصرع میں تین تین 'کی' کے اجتماع کا عیب بھی جاتا رہے گا۔

اصغر صاحب: طور پہ لہرا کے جس نے پھونک ڈالا طور کو ؎ اک شرارِ شوق بن کر میرے آب و گل میں ہے

شاہ صاحبؒ: اس شعر میں اولاً پہلے مصرع میں دوم تبہ طور کی تکرار اچھی نہیں معلوم ہوتی، دوسرے اس میں گذرے ہوئے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو اگرچہ بغیر علامت ماضی کے اظہار کے بھی صحیح ہے، اور معنی بھی سمجھ لیے جاتے ہیں، لیکن اگر اس کا اظہار ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، تیسرے لفظ 'جس نے' کا اقتضاء یہ ہے کہ مصرع ثانی میں 'اک' کے بجائے 'وہ' کی ضمیر لائی جاتی اور اس موقع پر 'اک' کے کوئی معنی بھی نہیں ہیں،

اصغر صاحب: جان ہے محوِ تجلّی چشم و گوش و لب ہیں بند ؎ حسن کو حسنِ بیاں، حسنِ نظر سمجھا تھا میں

شاہ صاحبؒ: اس شعر میں چند در چند لفظی اور معنوی نقائص ہیں، لفظی اور نہایت فاحش نقص یہ ہے کہ فارسی معطوف معطوف علیہ کے بعد 'ہیں بند' کا ٹکڑا لگا دیا ہے، جو اگرچہ قاعدہ کے اعتبار سے صحیح ہے، لیکن اس قدر غیر فصیح، ثقیل اور ناہموار ہے کہ ذوق سلیم کیا، کانوں کو یہ شتر گربگی سخت ناگوار معلوم ہوتی ہے، معنوی خامی یہ ہے کہ اولاً مصرع ثانی میں حسن بیان صحیح نہیں ہے، دوسرے دونوں مصرعوں میں معنوی ربط بے جوڑ ہے، شاعر کا مقصد یہ ہے کہ میں حسن کو حسن بیان اور حسن نظر سمجھتا تھا لیکن جان ایسی محو تجلی ہوئی کہ آنکھ کان، لب سب محو حیرت ہوگئے، اور حسن حسن نظر اور حسن بیان باقی نہیں رہا، حسن

دیکھنے والے کے لیے حسن نظر تو ہر حالت میں ہے، اس لیے اس کا تعلق تو اس سے صحیح ہے، لیکن حسن بیان نہیں ہے، حسن بیان کا تعلق حسن سے البتہ ہو سکتا ہے، لیکن یہاں پر یہ مقصود نہیں ہے، دوسرے محویت جلوہ خود ایک حسن نظر ہے، اس لیے کہ تجلی چشم ظاہر سے دیکھی جاتی ہے، اگر محو تجلی کے بجائے محو حقیقت ہوتا تو شاعر کا خیال صحیح ہو سکتا تھا۔

اصغر صاحب: جسم کو اپنا سا کر کے لے اڑی افلاک پر ؎ اللہ اللہ! یہ کمال روح جولاں دیکھیے

شاہ صاحبؒ: جولان عربی مصدر ہے، اس کو فارسی اسم فاعل کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔

اصغر صاحب: در پہ جو تیرے آگیا اب نہ کہیں مجھے اٹھا ؎ گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

شاہ صاحبؒ: اس شعر میں "آگیا" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً نہیں، بلکہ پھرتا پھراتا اتفاقیہ آگیا، اس کے بجائے دور تک پہونچ جانے کا ہم مفہوم جملہ ہونا چاہیے تھا، "اب نہ کہیں مجھے اٹھا" سے اگرچہ مطلب نکل آتا ہے، لیکن اس کے بجائے "اب نہ یہاں سے تو اٹھا" ہوتا تو زیادہ مناسب تھا، معنوی نقص یہ ہے کہ گردش مہر و ماہ دیکھنا کوئی ایسا کمال نہیں ہے جو نہ اٹھانے کا سفارشی بن سکے، اگر گردش کے بجائے جلوہ ہوتا تو زیادہ مناسب اور معنی خیز ہوتا کہ تیرے آستان تک پہونچنے میں مہر و ماہ کے جلوے بھی نظر آئے، لیکن میں نے ان پر آنکھ نہیں ٹھہرائی۔

اصغر صاحب: جہاں کی خیر ہو جانِ حزیں کی خیر ہو یا رب! ؎ کہ لو اونچی ہوئی جاتی ہے اب سوز محبت کی

شاہ صاحبؒ: لفظی خامی یہ ہے کہ "لو" "سوز" کی نہیں ہوتی، اس کے لیے شعلہ ضروری ہے، جو سوز کے بعد کا درجہ ہے، وہ بھی عموماً شمع کے لیے آتا ہے، معنوی اعتبار سے یہ خرابی ہے کہ اک عاشق جانباز کے لیے سوز محبت کی زیادتی پر جان کی خیر منانا شان عشق سے بعید ہے، اس کا تو کام یہ ہے کہ سوز عشق میں جل کر خاکستر ہو جائے اور منھ سے اُف نہ نکلے۔

اصغر صاحب: کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا ؎ خود اپنا طرز نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

شاہ صاحبؒ: اس موقع پر "کبھی" کا لفظ تقابل چاہتا ہے، اس لیے مصرع ثانی میں مصرع اول کا مقابل مفہوم ہونا چاہیے، دوسرا مصرع یوں ہوتا تو اچھا تھا:

ع۔ خود اپنا پرتو ہے جو کچھ کہ دیکھتا ہوں میں

اصغر صاحب: اٹھا رکھا ہے اس نے اپنے جلوے کو قیامت تک ؎ قیامت ہے وہ جلوہ اس کو کیا حاجت قیامت کی

شاہ صاحب: مصرع ثانی اس طرح ہونا چاہیے

قیامت ہے وہ خود ہی اس کو کیا حاجت قیامت کی

اصغر صاحب: یہ آنا جلوہ بن کر اور پھر میری نظر ہونا ؎ ہسی ہے دید تو پھر دید بھی اے فتنہ گر ہوتا

شاہ صاحب: یہ شعر نقص ادا اور ژولیدگیٔ بیان کا بدترین نمونہ ہے، نقص بیان کی وجہ سے اس کا مطلب بھی خبط ہو گیا ہے، شاعر جمالِ حقیقت کی نیرنگی اور شعبدہ بازی دکھانا چاہتا ہے کہ جب وہ جلوہ بھی دکھاتا ہے تو خود ہی نظر بن جاتا ہے، اس کے بعد کہتا ہے کہ جب یہی شعبدہ بازی ہے تو دید کا لطف بھی تیرا ہی رہا، لیکن اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جو الفاظ انتخاب کیے گئے ہیں اور ان کی جو ترکیب ہے اس سے زیادہ غیر فصیح قیاس میں بھی نہیں آسکتے، پہلا مصرع تو قابل انگیز ہے لیکن دوسرا مصرع تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی مبتدی کا کہا ہوا ہے، لفظی خوبیوں سے قطع نظر اس کے معنی کیا ہوئے۔

اصغر صاحب: تماشا ہو نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا ؎ میں ان کا دل سمجھتا ہوں وہ میرا دل سمجھتے ہیں

شاہ صاحبؒ: یہ شعر نقص بیان کی وجہ سے موضوع الفاظ کا مہمل مجموعہ معلوم ہوتا ہے، غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ ناز و نیاز کی کشاکش کا تماشہ ہے کہ میں ان کا دل اپنا سمجھتا ہوں اور وہ میرا دل اپنا سمجھتے ہیں، لیکن اس شعر کے الفاظ سے یہ مطلب ادا نہیں ہوتا، بلکہ اس سے محض "دل شناسی" کے ملکہ کا پتہ چلتا ہے، جو نہایت حیرت انگیز ہے۔

اصغرؔ صاحب: یہ ذوقِ دید کی شوخی، وہ عکسِ رنگِ مجوبی ؎ نہ جلوہ ہے نہ پردہ ہم اسے تنہا سمجھتے ہیں

شاہ صاحبؒ: اس شعر میں 'تنہا' کا لفظ بالکل بے محل اور بے جوڑ ہے، تنہا کہنا اس وقت صحیح ہوتا جب پردے اور جلوے کی حیثیت دوئی کی ہوتی، حالانکہ یہ دونوں کیفیتیں ہیں، انھیں یکتائی اور دوئی سے کوئی علاقہ نہیں،

اصغرؔ صاحب: نظارۂ پُرشوق کا اک نام ہے جینا ؎ مرنا اسے کہیے کہ گذرتے ہیں اِدھر سے

شاہ صاحبؒ: اس شعر میں لفظی نقص یہ ہے کہ 'اک' حشو ہے، معنوی خرابی یہ ہے کہ جب جینا نام ہے نظارۂ شوق کا تو مرنا اس کے مقابلہ میں محرومی کا نام ہوتا ہے، لیکن مصرعِ ثانی سے اس کے برعکس مطلب نکلتا ہے، کیونکہ معشوق کے اِدھر سے گذرنے سے نظارۂ شوق کے اور مواقع پیدا ہوتے ہیں، اور اگر گذرنا 'چلے جانے' کی جگہ استعمال کیا گیا ہے تو یہ درست نہیں۔

اصغرؔ صاحب: اس کے سوا تو معنیٔ مجنوں بھی کچھ نہیں ؎ ایسا بھی ربطِ صورتِ لیلےٰ نہ چاہیے

شاہ صاحبؒ: یہ شعر معنی سے بے نیاز اور خالص صوفیانہ چیستاں ہے، اسی قبیل کا یہ شعر ہے ؎

کائناتِ دہر کیا، روح الامیں بیہوش تھے ؎ زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

شاعر کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سالکین راہِ حقیقت کی موت وصلِ حبیب کا پیام ہوتی ہے، اس لیے ان کی زندگی قضا کا جو وصل کا دیباچہ ہے مسکرا کر استقبال کرتی ہے، لیکن الفاظ سے یہ معنی ظاہر نہیں ہوتے، اگر اسے مان بھی لیا جائے تو اس پر کائناتِ دہر اور روح الامین کی بیہوشی کے کیا معنی؟۔

آخر میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ہم نے نمونہ کے طور پر محض تھوڑے سے اشعار نقل کیے ہیں، ورنہ اس مختصر مجموعہ میں اس قبیل کے اور اشعار بھی ہیں، طرزِ ادا کے نقص سے تو ان کے بہت کم اشعار خالی ہیں، امید ہے کہ اصغرؔ صاحب آیندہ اپنی شاعری کے بادۂ ناب میں پردۂ مینا کی شفافیت کی جانب بھی پوری توجہ رکھا کریں گے، ان کے جیسے بلند مرتبہ شاعر کے لیے اس قسم کے اسقام زیبا نہیں ہیں۔

سرودِ زندگی میں اصغرؔ صاحب کا کچھ فارسی کلام بھی ہے، اس کے متعلق شاہ صاحبؒ نے لکھا کہ خیالات کے اعتبار سے یہ کلام بھی اردو کا ہم پایہ ہے، لیکن زبان میں فارسیت نہیں ہے، اس تبصرہ سے موجودہ دور کے نقاد یہ درس لے سکتے ہیں کہ تنقید نگاری میں ذوقِ سلیم کے ساتھ دیدہ وری اور بصیرت ہو تو اس کا رنگ کتنا خوشرنگ ہو سکتا ہو۔

(باقی)

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فریدؒ مسعود گنجشکرؒ کے مجموعۂ ملفوظات راحتُ القلوب کا مطالعہ

از مولانا اخلاق حسین دہلوی

(۲)

اس قسم کی بعض اور روایتیں بھی ہیں، ان سے واضح ہے کہ راحت القلوب معتبر و مستند بھی ہے، اور مابعد کی کتبِ ملفوظات کا ماخذ بھی ہے، اب ان کی سیر و سیاحت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سیاحت سیاحت عہدِ وسطیٰ کے درویشوں کا محبوب مشغلہ رہا تھا، وہ اس پُرآشوب زمانہ میں بھی برابر حرکت میں رہے ہیں، حرکت میں برکت بھی ہے، اور سفر وسیلۂ ظفر بھی ہے، حضرت باباصاحبؒ نے بھی اس عہد میں سیاحت فرمائی، بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے، اور اپنے فیوض و برکات سے مخلوق کو نوازا، یہ بہت بڑا کام تھا، جسے سرانجام فرمایا، اسرار الاولیاء میں اور راحت القلوب میں آپ کے ممالکِ غیر سے سفر و سیاحت کا ذکر بھی ملتا ہے، راحت القلوب سے جن مقامات کی سیر و سیاحت کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ ہیں:

بخارا، غزنی، سیوستان، بدخشان، بغداد اور سمتِ مغرب۔

سمتِ مغرب سے مراد ملکِ شام اور فلسطین خصوصاً بیت المقدس ہو سکتا ہے، جہاں آپ نے

جاروب کشی کی خدمت بھی انجام دی تھی،

یقین ہے کہ بعض مقامات کا ذکر ملفوظات کے ان مجموعات میں بھی ہوگا جو دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے، اور آج نایاب و ناپید ہیں، فوائد الفواد میں صرف ایسے سفر کا ذکر ملتا ہے جس کا تعلق اندرون ملک سے ہے، بیرونی ممالک کی سیاحت کا ذکر اس میں نہیں ہے، مگر یہ وجہ انکار نہیں ہو سکتی، خواجہ امیر حسن علاء سجزی کے اسلوب کا وصف ایجاز ہے، جس کی بدولت کتنی ہی اطلاعات ناتمام رہ گئی ہیں۔

فوائد الفواد میں وہ سب کچھ ہے جو حاضرین مجلس کے دکھ درد کی دوا ہے، مگر یہ سمجھنا کہ جو کچھ فوائد الفواد میں نہیں ہے، اس کا وجود ہی نہیں ہے، معقولیت سے بعید ہے، اس میں روغن فروش کی بیوی[1] کا اور میر شکار کے واقعہ[2] کا ذکر بھی نہیں ہے، جو نہایت درجہ حیرت انگیز اور بصیرت افروز ہے، اس میں لق و دق صحرائے اجودھن[3] میں بڑے اور گھنے دار درخت کے نیچے حضرت باباصاحبؒ کے قیام فرمانے کا اور حضرت باباصاحبؒ کے چلۂ معکوس[4] کا ذکر بھی نہیں ہے، (جو دیگر کتب میں ہے) تو کیا ان سبھی سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ فوائد الفواد بلا شبہ رشد و ہدایت کا صحیفہ ہے اور سالکان راہ سلوک کے لیے خضر راہ ہے، مگر انسانی کارنامہ ہے، جو سہو و خطاء سے مبرا نہیں ہوتا، لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ راحت القلوب کا بیان صداقت پر مبنی ہے، جس کا تعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کے قلم سے ہے، اور اس باب میں راحت القلوب کو ہر اعتبار سے فوقیت ہے، اور اس بنا پر حضرت باباصاحبؒ کی غیر ملکی سیاحت کا ذکر لائق تسلیم اور قابل قبول ہے۔

۱۳۔ خرق عادت و کرامت کائنات عالم کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ہر شے عجائبات قدرت سے مالا مال ملے گی، جب یہ ہے تو خرق عادت اور کرامت سے وحشت کیوں؟ البتہ اتنی بات ہے کہ جو عجائبات دیکھنے میں آتے رہتے ہیں، طبیعت اُن سے مانوس ہو جاتی ہے تو ان کا عجوبہ پن نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور جن سے گاہ بہ گاہ واسطہ پڑتا ہے انھیں دیکھ کر انسان محو حیرت ہو جاتا ہے، ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں، جو

[1] خیر المجالس ص ۲۲۳، [2] خیر المجالس ۱۴۷-۱۴۸، [3] خیر المجالس ص ۸۹ [4] سیر الاولیاء ص ۶۸ و ۶۹ ج۔

فہم و ادراک میں سماتی نہیں، جیسے نابالغ بلوغ کی کیفیت کے احساس سے نابلد ہوتا ہے، مگر فی نفسہٖ بلوغ کی کیفیت کیفیت ہے، جو عمر کی مخصوص منزل سے متعلق ہے، اس سے انکار کی گنجائش نہیں حضرت محبوب الٰہیؒ نے کیسی پیاری بات کہی ہے:

"جو بات عقل سے بعید ہے، وہ کچھ اور ہے، اور جو عقل میں نہ سمائے وہ کچھ اور ہے، وہی کرامت ہے"

(فوائد الفواد ص ۷)

ادراک کی معذوری ادراک ہی کا نقص ہے، ورنہ کرامت و خرق عادت فی نفسہٖ حقیقت حقہ ہیں، جو بالطبع انسان کو مرغوب ہیں، صوفیۂ کرام نے اس وصف سے بھی کام لیا ہے جو آج نایاب ہے، جس سے کارہائے نمایاں ظہور میں آئے ہیں، راحت القلوب میں بھی محیر العقول واقعات ہیں جو عہد وسطیٰ کے ادب عالیہ کا طرۂ امتیاز ہے، اگر راحت القلوب میں یہ وصف نہ ہوتا تو عصری اثرات سے محروم ہوتی جو اس کی خوبی نہیں نقص متصور ہوتا، کرامت و خرق عادت ایک حقیقت ہے، اور کسی حقیقت سے روگردانی بعید از عقل ہے۔

۱۴۔ حوالہ جات حضرت باباصاحبؒ کے بیان کا یہ بھی وصف ہے کہ آپ دوران تقریر میں ماخذات کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے، اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے، راحت القلوب میں کم و بیش چونتیس[34] حوالہ جات ہیں، ان میں بعض وہ کتابیں ہیں جو اس عہد میں متداول تھیں، اور آج بھی مستند و معتبر ہیں، مثلاً:

(۱) قوت القلوب (ابو طالب مکیؒ) (۲) کفایہ (امام شعبیؒ) (۳) کشاف (زمخشری معتزلی کی تفسیر) (۴) مفصل (زمخشری کی کتاب النحو) (۵) تفسیر زاہدی (مولانا برہان الدین زاہد صاحب ہدایہ)

بعض ایسی کتب و رسائل ہیں جو اکابر صوفیہ سے متعلق ہیں، مثلاً:

(۱) اوراد شیخ عثمان ہارونیؒ (۲) اوراد شیخ معین الدین سجزیؒ (۳) اوراد خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ (۴) شرح خواجہ معین الدین سجزیؒ (۵) اوراد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (۶) ہشت اِندام

از زبان شیخ الاسلام قطب الدین بختیارؒ وغیرہ ۔

بعض اور کتابیں بھی ہیں جن کا ذکر تذکار کی تصانیف میں ملتا ہے، بہرحال حوالہ جات سے بیان کی اہمیت واضح ہوتی ہے، جس سے راحت القلوب کا مستند و معتبر ہونا پوری طرح ثابت ہے۔

۱۵۔ ادعیۂ ماثورہ | ادعیۂ ماثورہ سے رغبت اور ان کی طلب انسانی فطرت کا خاصہ ہے، تدابیر میں کامیابی کے لیے بھی انسانی فطرت ادھر ہی جھکتی ہے، قرآن پاک ادعیہ کا خزینہ ہے، کتب احادیث میں ادعیہ کے مستقل ابواب ہیں، بعض بزرگوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ادعیہ سے بے اعتنائی خلاف فطرت ہے۔

اسلام کی تعلیم ہے کہ قدم قدم پر خدا کی یاد تازہ رہے، مسلمان لمحہ بھر بھی یاد الٰہی سے غافل نہ ہو، اس لیے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، غرض کہ ہر ہر نقل و حرکت کے لیے ادعیہ کا ذخیرہ موجود ہے، اسے وظائف انبی صلعم سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، انسان جب مشکلات کی دلدل میں پھنستا ہے، تدابیر بھی جواب دے بیٹھتی ہیں تو اس بے چارگی کے عالم میں ادعیہ ہی کے وسیلہ سے سہارا ملتا ہے، بلکہ کاربرآری کی راہیں کھل جاتی ہیں، مستشرقینِ یورپ جنھوں نے اسلامیات کا اور مسلمانوں کے عروج و زوال کا گہرا مطالعہ کیا ہے، انھیں بے تکلف یہ کہنا پڑا ہے کہ جب کبھی مسلمانوں پر برا وقت پڑا ہے تو تصوف ہی نے انھیں سہارا دیا ہے، اور پستی سے بلندی پر لا بٹھایا ہے، ادعیہ بھی تصوف ہی کا ایک شعبۂ عمل ہے، اس سے ادعیہ کی اہمیت ظاہر ہے۔

فوائد الفواد میں منتشر طور پر ادعیہ کا اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر یکجا کر لیا جائے تو اچھی خاصی کتاب الادعیہ تیار ہو جائے، راحت القلوب میں اتنا تو نہیں لیکن جتنا کچھ ہے گراں قدر ہے، اور خوبی کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر یکجا ہے، تلاش کرنے کی زحمت سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

راحت القلوب کا وہ حصہ جو ادعیۂ ماثورہ پر مشتمل ہے منھ سے پڑا بول رہا ہے کہ معاشرہ کی وہ

کیا کیفیت تھی جس کے تدارک کے لیے ان ادعیہ کی ضرورت تھی، ادعیہ کے رواج سے نکوکاری کو فروغ ہوتا ہے، معاشرے میں سدھار آتا ہے، صحت مند سوسائٹی وجود میں آتی ہے، جو انسانیت کے عروج کے لیے بہت ضروری ہے، ادعیہ کو اپنانے کے لیے اخلاص عمل درکار ہے اور کچھ بھی نہیں، بقول شخصے کہ یہ سستے قسم کا لٹریچر سہی لیکن نہایت درجہ مفید اور کارآمد ہے۔

۱۶۔ اسلوب بیان | راحت القلوب کی زبان اتنی سادہ، سلیس اور بامحاورہ ہے کہ بے تکلف اسے سہل ممتنع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، سلوک کے پیچیدہ اور اہم مسائل کو سلجھا کر اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ مفہوم و مطلب دل میں اترتا چلا جاتا ہے، ہر خطے اور ہر طبقے کا فارسی داں بآسانی سمجھ لیتا ہے، زبان کی یہ خوبی نادر و نایاب ہوتی ہے، مگر راحت القلوب اس وصف سے مالا مال ہے، اس کے اسلوب میں ایسی پذیرائی اور دلآویزی ہے کہ دامنِ دل کو پکڑے ہی رہتی ہے۔

اس میں کارآمد ہدایتیں اور نصیحتیں کچھ اس خوبی سے جلوہ پیرا ہیں کہ دل قبول کیے بغیر رہتا ہی نہیں ہے، بلکہ پڑھنے والا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں ان ہدایتوں پر عامل ہو گیا ہوں اور مجھے ہدایت نصیب ہو گئی ہے، جو کچھ سیکھنا تھا سیکھ لیا ہے، عمل پیرا ہونا بھی کچھ مشکل نہیں، ایسا لگتا ہے کہ نیک بندوں میں سے ہو گیا ہوں۔

ایسے بھی مقام آتے ہیں کہ طبیعت پر کیف طاری ہو جاتا ہے، آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں، اور دل رونے لگتا ہے، عجب کیف و سرور کا عالم ہوتا ہے جو احاطۂ تحریر میں سما نہیں سکتا، رو دھو لیتا ہے، تو اپنے کو ہلکا پھلکا اور صاف ستھرا پاتا ہے اور اپنے کو عجب نورانی فضا میں محسوس کرتا ہے۔

ترغیب و تحریص اور تخویف کچھ ایسے موثر انداز میں ہے کہ دل کو موہے بغیر رہتی نہیں ہے، کشش و جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا، طبیعت ھل من مزید ہی کہتی رہتی ہے، اہلِ دل اس کے کیف سے آج بھی تسکین ہو سکتے ہیں، یہ اسی

وصف کا پرتو ہے کہ جس کی طرف حضرت محبوب الٰہیؒ نے اشارہ فرمایا تھا:

"بارہا در ذوق بیان ایشاں مردم چناں فروی شد کہ تمنا بردہ شدے کہ اگر ہمیں زماں مردم بمیر دنیکو باشد" (فوائد الفواد ص ۷۵)

اسے حضرت محبوب الٰہیؒ کے اخلاص عمل سے تعبیر کیجیے یا حضرت بابا صاحبؒ کی تاثیر کلام سے، بات ایک ہی ہے، کاش کہ راحت القلوب کا کوئی کامل نسخہ دستیاب ہوتا، تو حقیقت حال زیادہ آشکارا ہوتی۔

۷۔ نفس مضمون | راحت القلوب کیا ہے؟ اسلامی تعلیمات اور روحانی قدروں کا نچوڑ ہے، اس کا لفظ لفظ ہدایت کے نور سے تجلی ہے، چشم بصیرت ہے تو اس میں بہت کچھ ہے ؎

دل کی نگاہ فکر کی بینائی چاہیے جلوے ہیں عام ظرف تماشائی چاہیے

اس میں بکثرت جواہر پارے ہیں، جن پر عمل پیرا ہونے سے زندگی بن جاتی ہے، اور عاقبت بخیر ہوتی ہے ایسی تعلیمات کے کچھ نمونے یہ ہیں:

(۱) حضرت بابا صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے اپنے استاذ محترم کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

(۱) "انسان جب تک محبت کی صیقل سے آئینۂ دل کو صاف نہ کرلے گا، اس وقت تک اللہ کے ذکر سے انسیت نہ ہوگی، البتہ جب درمیان میں کوئی شے حائل نہ رہے گی تو وصال حق کی لذت سے بھی لطف اندوز ہوگا، ورنہ خدا رسی کی نعمت نصیب نہ ہوگی۔"

(۲) "درویشوں کے متعلق بہر حال حسن ظن رکھنا چاہیے، تاکہ اس حسن ظن کی برکت سے حق کی حمایت حاصل رہے۔"

(۳) "درویشی پردہ پوشی ہے، خرقہ اسی کے لیے ہے جو ہر کسی کی پردہ پوشی میں ساعی ہے، اور عیب جوئی سے محترز رہتا ہے، جب یہ وصف پیدا ہوتا ہے تو اس وصف سے متصف درویشوں میں شامل

ہوجاتا ہے، اور اس کا مدعا پورا ہونے لگتا ہے۔"

(۴) "جو کچھ خدائے پاک کی رضا کے مطابق صرف کیا جاتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ہو، اسراف نہیں ہے، البتہ جو کچھ اس کے خلاف صرف ہوگا وہ اسراف ہے، اس سے محترز رہنا چاہیے، لا اسراف فی الخیر۔"

(۵) "جوہر سعادت تو سبھی میں ہے، فضل الٰہی بھی ہر ایک کے شامل حال ہے، تاہم جد و جہد لازم ہے اس لیے کہ جو بھی مرتبے کو پہونچا ہے، کوشش و مجاہدے کے وسیلے سے پہونچا ہے۔"

(۶) "انسان اور اللہ پاک کے درمیان دنیا سے بڑھ کر کوئی پردہ نہیں ہے، یہی حجاب اکبر ہے۔"

(۷) "دنیاوی کاموں میں مشغول رہنے سے دل مردہ ہوجاتا ہے، وہ شرائین خشک ہوجاتی ہیں جن پر احساسات لطیفہ کا دارومدار ہے، ذاکر و شاغل رہنا چاہیے، تاکہ دل ذکر و شغل کے نور سے منور اور زندہ رہے۔"

(۸) "جو درویش دنیاوی مشاغل میں منہمک رہتا ہے اور عز و جاہ کا طالب ہے، وہ درویش نہیں مردود طریقت ہے۔"

(۹) "جو خرقہ پہنے اور درویشی کا روپ رچائے، پھر امیروں اور دنیاداروں سے میل ملاپ رکھے، مرغن کھانے کھائے وہ درویش نہیں، راہ گم کردہ ہے۔"

(۱۰) "ذکر میں اتنا منہمک رہنا چاہیے کہ رونگٹا رونگٹا ذاکر بن جائے ...... جو شخص جو کچھ کرتا مرے گا، وہی کرتا بروز قیامت اٹھے گا، زندہ ہوگا۔"

(۱۱) "دل کا اللہ کی یاد میں لگا رہنا، راہ سلوک میں دل کا زندہ رہنا ہے، جو اصل حیات ہے، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں، یہ خوبی نصیب ہوتی ہے اکل حلال سے، اور دنیاداروں سے کنارہ کشی اختیار کرنے سے۔"

(۱۲) "صحابۂ کرامؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم و آگاہی حاصل کرتے تھے اس سے اوروں کو بھی

فیضیاب فرماتے تھے۔"

(۱۳) "شیخ طریقت کو اتنی قدرت و کمال حاصل ہو کہ جب کوئی بیعت و ارادت کی غرض سے آئے تو اپنی ذاتی صلاحیت اور نورِ معرفت کی تاثیر سے طالب کے کدورت آلودہ دل کو آئینہ بنا دے، اگر یہ وصف نہیں ہے تو پیر و مرید دونوں گم کردہ راہ ہیں۔"

(۱۴) "اگر کسی کو شیخِ کامل نہ ملے تو اسے اہلِ سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے اور بقدرِ امکان عمل بھی، شیخِ کامل نہ ملنے کی تلافی ہو جائے گی۔"

(۱۵) "شیخ کو چاہیے کہ مرید کو ہدایت کرے کہ وہ سرمایہ داروں اور امیروں سے ربط ضبط نہ بڑھائے، بلکہ الگ تھلگ رہے، دنیاوی دولت کا طالب نہ ہو، زیادہ نہ بولے، اور بلا ضرورت قدم باہر نہ نکالے۔"

(۱۶) "نماز مومن کی معراج ہے، الصلوٰۃ معراج المؤمنین۔"

(۱۷) "نیک بندوں اور نکوکاروں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے، حدیث شریف میں ہے: صُحْبَۃُ الصّٰلِحِیْنَ نُوْرٌ وَّ رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ (نیکوں کی صحبت نور ہے اور رحمت ہے تمام عالم کے لیے)

(۱۸) "جو خدائے پاک کے کام میں لگا رہتا ہے، احکام خداوندی کی تعمیل میں منہمک رہتا ہے، رب العزت اس کے کاموں میں آسانی فرماتے ہیں اور وہ بے تردد سرانجام ہو جاتے ہیں۔"

(۱۹) "کسی کے پلے میں بندھ جاؤ، کسی کے مرید ہو جاؤ، کچھ نہیں تو مخلوق کی خدمت کے ہو رہو، کسی مقامِ عزت پر فائز ہو جاؤ گے۔"

(۲۰) "ورد و وظائف کے لیے جو وقت مقرر کر لیا ہے، اس کا پابند رہنا چاہیے، اگر بشریت کے تقاضے کے وقت پر سرانجام نہ ہو سکے تو پھر کسی اور وقت اسے انجام دے لو، دن کو قضا ہو گیا ہے تو رات کو پورا کر لو، ترک نہ کرو۔"

(۲۱) "ہر شے کی حد و انتہا ہوتی ہے اور غایت بھی، عبادت کی غایت عقل ہے اور فراست، علم کے بغیر عبادت رنج بیہودہ ہے، اور علم عقل کے بغیر دردِ سر ہے۔"

(۲۲) "علم کیا ہے، ابرِ رحمت ہے، رحمت ہی رحمت اس سے برستی ہے۔"

(۲۳) "حدیث شریف میں ہے: ایک فقیہ عالم ایسے ہزاروں عابدوں سے افضل ہے جو دن میں روزہ رکھتے ہیں اور رات کو کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔"

(۲۴) "جب کوئی حصولِ علم میں غفلت روا نہیں رکھتا اور علم حاصل کر لیتا ہے تو اس کو حق جل شانہٗ حق کو باطل سے، نیکی کو بدی سے اور حرام کو حلال سے امتیاز کرنے کی توفیق عنایت فرما دیتے ہیں۔"

(۲۵) "زبان سے اللہ پاک کا ذکر کرتے رہنا ایمان کی نشانی ہے، نفاق سے رستگاری ہے، بلیات سے پناہ و حفاظت ہے، اور اس کی بدولت دوزخ سے خلاصی نصیب ہوتی ہے۔"

(۲۶) "کوئی ذکر قرآن پاک کی تلاوت کے برابر نہیں ہے، یہ سب سے افضل و بہتر ہے، اس کا اجر و ثمرہ تمام عبادتوں سے اعلیٰ و افضل ہے۔"

(۲۷) "دعا سے بڑھ کر اللہ پاک کے نزدیک اور کوئی شے نہیں ہے، اللہ پاک کو سب سے پیارا وہ ہے جو دعا میں مشغول رہتا ہے لیس شیئٌ اکبر عند اللّٰہ من الدعاء" (الحدیث)

یہ ہیں معدودے چند جواہر پارے، جن کی تعلیم حضرت بابا صاحبؒ نے فرمائی ہے، اور جو راحت القلوب کے اوراق کی زینت ہیں۔

اہم ترین روایتیں کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ کتب ملفوظات کے اسلوب اور نقطۂ نظر میں ہم آہنگی ہے، البتہ جن مجالس میں ایسے بھی سامعین شریک ہوتے ہیں جنھیں مخلوق کی خدمت و رہنمائی کی اور شیخ کی جانشینی کی ذمہ داری سنبھالنی ہوتی ہے تو ان مجالس میں کچھ اہم ترین روایتیں بھی بیان کر دی جاتی ہیں، جو مفادِ عامہ کے سوا خصوصی فوائد اور خصوصی رہنمائی کے وصف کی جامع ہوتی ہیں۔ ان میں

کچھ ایسے نکات بھی ہوتے ہیں کہ سطحی نگاہیں ان کی کنہ کو نہیں پہونچتیں، راحت القلوب میں بھی بعض ایسی روایتیں ہیں جن کی تفہیم عام اذہان کی گرفت میں نہیں آتی، یہاں ان ہی کی قدرے موشگافی مقصود ہے تاکہ عوام تردد بے جا میں مبتلا ہوکر گمراہ نہ ہوجائیں، اللہ پاک حق کی حمایت کی توفیق عنایت فرمائیں،

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

روایت (۱) حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں بارگاہ رب العزت سے خرقہ عنایت ہوا تھا، آپ معراج سے تشریف لائے تو صحابۂ کبار رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا مجھے بارگاہ ایزدی سے خرقہ ملا ہے اور حکم ربی یہ ہے کہ میں یہ خرقہ تم میں سے کسی ایک کو تفویض کروں، اب ایک بات میں تم سے دریافت کرتا ہوں، تم میں سے جو بھی صحیح جواب دے گا، یہ خرقہ میں اسے دے دوں گا، پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے دریافت کیا کہ اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سچائی اختیار کروں گا، خدائے پاک کی عبادت کروں گا اور جو دنیاوی مال ومنال ہے، وہ سب راہِ خدا میں صرف کردوں گا، پھر امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ سے دریافت کیا کہ اگر خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے، حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا کہ میں عدل سے کام لوں گا اور بندگانِ خدا سے انصاف برتوں گا اور مظلوموں کی حمایت کروں گا، پھر امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ سے دریافت کیا کہ اگر یہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے؟ تو حضرت عثمان غنیؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں باہمی میل ملاپ سے کام کروں گا، حق کی پیروی کروں گا، شرم اختیار کروں گا، اور سخاوت کروں گا، پھر آپ نے امیر المومنین سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا کہ اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے؟ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں پردہ پوشی کروں گا اور بندگانِ خدا کے عیبوں کو چھپاؤں گا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی لو! یہ خرقہ میں تمھیں دیتا ہوں، مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہی حکم تھا کہ تمھارے احباب میں سے جو یہ جواب دے

اسی کو یہ خرقہ دے دینا۔ (راحت القلوب ص ۳-۴)

حضرت باباصاحبؒ یہ بیان کرکے زاروقطار رونے لگے اور بیہوش ہوگئے، جب ہوش میں آئے تو فرمایا کہ درویشی پردہ پوشی است۔ یعنی پردہ پوشی ہی کا نام درویشی ہے، پردہ پوشی کی عادت اخلاقیات کا اہم رکن ہے، اس کے فقدان سے انسان مہلک مصائب میں مبتلا ہوجاتا ہے، جس قدر بھی اس پر عمل پیرا ہوگا اتنا ہی وہ امن وعافیت سے رہے گا، اسے درویشی کا اصل اصول سمجھنا چاہیے، اس کے فضائل وفوائد احاطۂ تحریر وتقریر میں سما نہیں سکتے ہیں، صوفیۂ کرام کے خرقہ کو اسی خرقۂ معراجیہ سے نسبت ہے۔

اس روایت میں دو نکتے ہیں، جن سے کچھ لوگ خلجان میں مبتلا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ وہ خرقۂ معراجیہ کو اپنی نافہمی سے مادی خرقہ تصور کرتے ہیں اور یہ غلط تصور ہے، خرقۂ معراجیہ مادی خرقہ نہیں لطیف غیبی ہے، وائرلیس کے شعاعی حروف اور اس کی عکس گاہ کے تصور سے یہ معمہ حل ہوجاتا ہے، خلق قرآن کا قائل گروہ بھی اس نکتہ کو سمجھ نہ سکا تھا، خرقۂ معراجیہ کے باب میں عالم وعارف خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) کا ارشاد ہے:

"خرقۂ معراجیہ ایک باطنی چیز ہے، اور راز خفی ہے، اور اشیائے محسوسہ میں سے نہیں ہے۔"

(مقابیس المجالس ص ۳۵۶، ترجمہ)

دوسرا خلجان وہ ہے جس کی طرف خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ نے اشارہ فرمایا ہے:

"حدیثِ خرقہ ___ اس حدیث اور قصے کو کتب حدیث میں جو صحیح ومعتبر ہیں میں نے کہیں نہیں دیکھا۔" (جوامع الکلم ملفوظ ۱۸ رشعبان ۸۰۲ھ)

نہ دیکھنا تو عدم وجود کی وجہ قرار نہیں پاتی، اگر فی الواقع ان کتب حدیث میں نہ بھی ہو جو صحیح اور مشہور ومعتبر ہیں تو بھی وجہ انکار لازم نہیں آتی، کیونکہ احصا کا تصور ناروا ہے، پھر اس کے بیان کرنے والے

وہ بزرگ ہیں جو متقیوں سے بڑھ کے متقی اور صاحب علم و عرفان اور بصیرت باطنی سے مالا مال تھے، جن کے قول پر پوری طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے، اور جو اصولِ حدیث سے بھی پوری آگاہی رکھتے تھے اور اصولِ حدیث کا درس بھی دیتے تھے[1]

[2]

یہ روایت مدت مدید سے مروج ہے، اسرار الاولیاء میں بھی ہے اور سیر الاولیاء اور فوائد الفؤاد میں بھی ہے کہ جس کو ادب صوفیہ میں بے مثل اور نہایت درجہ مستند مانا جاتا ہے، اہم ترین یہ ہے کہ موضوعات میں سے نہیں ہے، بہرحال خرقۂ معراجیہ لطیفۂ غیبی اور امور باطنیہ سے متعلق ہے، اور خرقۂ فقر اسی کی نسبت سے مالا مال اور گوناگوں اوصاف کا جامع ہے، ان نکات کے ذہن نشین ہونے کے بعد اس روایت کو سمجھ لینے میں کوئی دشواری حائل نہیں رہتی۔

روایت (۲) | حضرت محبوب الٰہیؒ نے لکھا ہے کہ محمد شاہ نامی ایک شخص آئے جو حضرت باباصاحبؒ کے دوستوں میں سے تھے، وہ بہت ہی پریشان حال تھے، کیونکہ ان کا بھائی قریب المرگ اور حالت نزع میں تھا، وہ آتے ہی زمین بوس ہوئے، حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا بیٹھو! وہ بیٹھ گئے، حضرت باباصاحبؒ روشن ضمیر تھے، سمجھ گئے کہ یہ پریشان حال کیوں ہیں، تاہم دریافت فرمایا کہ پریشان کیوں ہو، انھوں نے عرض کیا کہ آپ کو روشن ہے کہ بھائی کی حالت سے پریشانی ہے، حضرت باباصاحبؒ نے بلا تامل فرمایا: تمھارا بھائی تو اچھا ہو گیا ہے، جاؤ دیکھ لو، وہ حکم پاتے ہی گھر پہونچے، دیکھتے کیا ہیں کہ بھائی بالکل تندرست ہو گیا ہے اور بیٹھا کھانا کھا رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ بیمار ہوا ہی نہ تھا:

(راحت القلوب ص ۴)

اس بیان میں حضرت باباصاحبؒ کی فرمودہ یہ تین۳ چیزیں ہیں: بنشیں، چرا متغیری، برو برادرِ تو نیکو شدہ است، باقی پورا بیان حضرت محبوب الٰہیؒ کا نوشتہ ہے، یہی ذکر فوائد الفؤاد (ص ۲۳۶) میں ہے

[1] سیر الاولیاء ص ۱۱۷۔ [2] سیر الاولیاء ص ۳۵۲۔

جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منقول اور خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ کا نوشتہ ہے، اور اگرچہ اسلوب بیان میں فرق ہونا فطری شے ہے، تاہم دیکھنا یہ ہے کہ جامعیت و بلاغت کے اعتبار سے ترجیح کسے ہے؟ چنانچہ جب حضرت باباصاحبؒ نے یہ دریافت فرمایا کہ چرا متغیری؟ پریشان کیوں ہو؟ تو انھوں نے عرض کیا: از حال برادر خود کہ روشن است، لیکن خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے اس خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"فرمود چہ حال است؟ گفت برادرے دارم رنجور و در ہم چنانکہ رمقے بیش نماندہ است
ایں ساعت کہ من بخدمت آمدم چہ عجب کہ تمام شدہ باشد بسبب آں در ہم و زیر و زبرم" (۲۳۶)

محل غور ہے کہ حسن ادب اور جامعیت و بلاغت اس اختصار میں ہے کہ از حال برادرِ خود کہ روشن است یا اس تفصیل میں ہے جو خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ کے قلم کا شاہکار ہے، اس کے علاوہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان میں اور بھی خوبیاں ہیں، جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں، البتہ یک جملے کی طرف توجہ مبذول کرانا مناسب ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت باباصاحبؒ کی زبانی نقل فرمایا ہے: برو برادرِ تو نیکو شدہ است، امیر حسن علاء سجزیؒ نے لکھا ہے: برو برادرِ تو صحت خواہد یافت، غور طلب یہ ہے کہ تسکین و طمانیت کے سر و سامان کا زیادہ جامع جملہ کون سا ہے، اور کون سا مقتضائے حال کے زیادہ مطابق ہے، بلا تکلف یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ راحت القلوب کے بیان کو ہر اعتبار سے فوائد الفؤاد کے بیان پر ترجیح ہے،

روایت (۳) | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ میں بغداد کی طرف مسافر تھا، میں شیخ اجل سجزی (سنجری) سے ملا، وہ بزرگ اور بارعب پیر تھے، میں ان کے جماعت خانہ میں داخل ہوا، میں نے سلام کیا، انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا، میری طرف دیکھا اور فرمایا: آؤ شکر عالم[1] آؤ، خوب آئے بیٹھو

[1] اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے کہ یہ شکر عالم ہیں خیر المجالس ص ۲۳۸ میں مرقوم روغن فروش کی بیوی کا واقعہ ذہن نشین رکھنا چاہیے، اس وصف کا تعلق اوصافِ ولایت سے ہے۔

میں بیٹھ گیا، اس تعمیلِ حکم سے وہ خوش ہوئے اور مجھ پر بہت کرم فرمایا، میں کئی دن ان کی خدمت میں رہا، میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی ان کی خانقاہ سے محروم گیا ہو، اگر کچھ نہ ہوتا تو وہ آنے والے کو چھوارے کی گٹھلی ہی دے دیتے اور یہ دعا دیتے کہ خدائے پاک تمھارے رزق میں برکت عنایت فرمائیں، میں نے وہاں کے رہنے والوں سے سنا ہے کہ آپ نے جس کسی کو یہ دعا دی وہ زندگی بھر کسی کا محتاج نہ ہوا۔

(راحت القلوب ص ۵)

شیخ اجل رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی کتب ملفوظاتِ خواجگانِ چشت میں اکثر ملتا ہے، لیکن متداول تذکرے ان بزرگ کے احوال میں خاموش ہیں، کتابت کا یہ بھی کرشمہ ہے کہ شیخ اجلؒ کو کہیں سنجری لکھا ہے، کہیں سرزی لکھا ہے اور کہیں شیرازی لکھ دیا ہے، فوائد الفواد ص ۸ میں شیرازی ہے اور ص ۲۳ میں سرزی ہے، سیر الاولیا ص ۳۲۵ ـ ۳۳۸ میں سرزی ہے اور ص ۴۷۱ میں شیرازی ہے، اسرار الاولیا ص ۳۲ میں سوزی ہے اور ص ۳۳ ـ ۶۵ میں سرزی ہے، راحت القلوب ص ۵ ـ ۷ میں سنجری ہے، بہرحال تاوقتیکہ کسی تذکرے سے تصدیق نہ ہو جائے اور یہ تحقیق نہ ہو جائے کہ وہ باشندے کہاں کے تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع شیخ اجلؒ سنجری تھے یا شیرازی تھے، یا سرزی تھے، کیونکہ کتب ملفوظات میں ان مختلف نسبتوں سے مرقوم ملتا ہے، البتہ راحت القلوب میں ایک ہی نسبت سے یاد کیا گیا ہے، پھر بھی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، لہٰذا یہ کہنا بالغ العلمی کے منافی ہے کہ سنجری[1] غلط ہے،

---

[1] زمانۂ قدیم میں ایران کے جنوبی و کوہستانی علاقہ کو سنگستان اور ملک نیمروز کہتے تھے، اور وہاں کے باشندوں کو سنگری کہتے تھے، سنجری (س ن ج ری) سنگری ہی کا معرب ہے، شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے:

"خواجہ معین الدین از سیستان است و اہلِ آں دیار را سنگری می خوانند، و او را سنجری می نویسند کہ معرب سنگری است۔" (اکبر نامہ ج ۲ ص ۱۵۴)

غالباً اہلِ ایران کے ذوقِ سلیم نے سنگستان کو گوارا نہیں کیا، انھوں نے اسے سیستان سے بدل دیا، چنانچہ

(باقی ص ۴۴۳ پر)

اور سجزی (س ج زی) صحیح ہے، صحیح دونوں ہی ہیں، لیکن سہل الادا ہونے کی بنا پر سنجری کو سجزی پر فوقیت ہے، اس لیے سنجری (س ن ج ری) لکھا، پڑھا اور بولا جاتا ہے لہٰذا جو کچھ حضرت باباصاحبؒ نے

(بقیہ ص ۴۴۲) ملک الشعراء فردوسی طوسی نے لکھا ہے:

منم کردہ ام رستم داستاں ... ولیکن یلے بود در سیستان

رستم کے باپ زال نے اسی کوہستانی علاقہ میں پرورش پائی تھی، جسے سنگستان سے سیستان کہا جانے لگا تھا۔ عربوں کا لہجہ گ ادا کرنے سے قاصر تھا، ان کے حروفِ ابجد میں گاف نہیں ہے، لہٰذا عرب جغرافیہ نویسوں نے سنگستان کو سجستان لکھا ہے، جسے اکثر ہندوستانی اہلِ قلم نے اپنایا ہے، اسی سے اسم منسوب سجزی (س ج زی) ہے، مگر اسے رواج عام نصیب نہیں ہوا، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس کے تلفظ میں عیب تنافر ہے، ج اور ز قریب المخرج ہونے کی وجہ سے بآسانی زبان سے ادا نہیں ہوتے، اہلِ علم تو بہ تکلف ادا کر لیتے ہیں، مگر عوام اس کا صحیح تلفظ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، غالباً اسی لیے تذکرہ نویسوں نے سنجری ہی لکھا ہے، سجزی (س ج زی) نہیں لکھا، البتہ خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ نے ضرورتِ شعری سے ایک شعر میں سجزی نظم کیا اور لکھا ہے؎

صنعے کہ جمع کردم محیط است بیش باراں ... حسنِ علاءِ سجزی کے از امیدواراں

اس کے علاوہ میرے علم میں کوئی دوسری مثال نہیں ہے، مگر شعرائے فارس نے اکثر سنجر اور سنجری ہی نظم کیا ہے، مولانا شیریں مغربیؒ عرفائے کاملین میں خوش گو شاعر گذرے ہیں، جن کا کلام آج تک محافلِ سماع میں سماعت ہوتا ہے، ان کا مشہور قطعہ ہے؎

چوں چترِ سنجری رخِ بختم سیاہ باد ... در دل بود اگر ہوسِ ملکِ سنجرم

زاں دم کہ یافتم خبر ملکِ نیم شب ... من ملکِ نیمروز بیک جو نمی خرم

مشہور عرب جغرافیہ نویس بلاذری نے اپنے بیان کے ساتھ سجستان کا جو نقشہ شامل کیا ہے اس میں ایک مقام کا نام سنج لکھا ہے (فتوح البلدان جزو ۲، حصہ ص ۵۵) غالباً یہی وہ مقام ہے جسے تذکرہ نویسوں نے تصحیف سنجر لکھا ہے، سنجری (س ن ج ری) قدیم زبان زدِ خاص و عام ہے اور بالکل صحیح ہے اسے غلط بتانا ہی غلط ہے،

بیان فرمایا اور جو کچھ حضرت محبوب الٰہیؒ نے نقل فرمایا، وہ حرف حرف صحیح ہے، اور اس روایت کو تسلیم کرنے میں کوئی معقول وجہ مانع نہیں ہے۔

روایت (۳) | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں کئی دن شیخ سیف الدین باخرزیؒ کی خدمت میں رہا، ان سے رخصت ہونے کے بعد رات کو ایک مسجد میں قیام کیا، اب میرے علم میں آیا کہ یہاں ایک صومعہ (عبادت خانہ) ہے، اور اس میں ایک بزرگ رہتے ہیں، میں اس صومعہ میں داخل ہوا تو میں نے وہاں ایک بزرگ کو دیکھا جو بہت ہی باعظمت و ہیبت تھے، مجھے اس وقت تک ایسے باعظمت و ہیبت بزرگ سے شرف ملاقات نصیب نہیں ہوا تھا، وہ عالم تفکر میں کھڑے تھے، اور آنکھیں ہوا کے رخ کھلی ہوئی تھیں، تین چار دن رات کے بعد وہ عالم صحو میں آئے، ہوشیار ہوئے، میں نے سلام کیا، انھوں نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: میرے سبب سے تمھیں تکلیف ہوئی، اچھا بیٹھو! میں بیٹھ گیا، انھوں نے فرمایا کہ میں شمس العارفین کے نبیوں (پوتوں یا نواسوں) میں سے ہوں اور تیس برس سے اس صومعہ میں معتکف ہوں، مگر اے فرید! اس تیس سالہ مدت میں حیرت و دہشت کے سوا مجھے کچھ نصیب نہیں ہوا ......

یہ حکایت طویل ہے اور حیرت انگیز ہے لیکن بہت ہی سبق آموز ہے، شمس العارفین نام و لقب کے کتنے ہی بزرگ گذرے ہیں، خدائے عزوجل را چند شمس العارفین اند (فوائد الفواد ص ۱۴) محمد عطا شمس العارفین ترک بیابانیؒ کا مزار پرانوار (ترکمان دروازہ) دہلی میں ہے، شاہ جمال شمس العارفین کا مزار پرانوار علی گڑھ میں ہے، شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے پیر طریقت کا نام شیخ عبد الواحد غزنویؒ تھا، جو شمس العارفین لقب سے یاد کیے جاتے تھے (خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۳۰۸) غزنی میں ایک بزرگ مولانا حسام الدین نبہ (ن ب ہ) تھے، جو حضرت شمس العارفین کے آزاد کردہ غلام تھے، نبہ ان کے نام کا لاحقہ ہے، ان کا ذکر حضرت محبوب الٰہیؒ کی مبارک زبان پر بھی آیا ہے، آپ نے فرمایا:

"مردے بود در غزنین او را مولانا حسام الدین نبہ گفتندے، نبہ شمس العارفینؒ بود، او مرید خواجہ

اجل سرزیؒ بود" (فوائد الفواد ص ۱۵۴ نولکشوری)

نبہ در اصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام کا نام ہے[1]، گو اس کے معنی میں مشہور، مگر اردو داں طبقہ اس لفظ سے فی الجملہ واقف نہیں ہے، چنانچہ ایک دانشور نے اسے نبیہ سمجھا، مگر یہ نہیں سمجھا کہ اگر یہ نبیہ ہے تو مولانا حسام الدین کا لاحقہ کیوں ہے؟ بہر حال یہ مولانا حسام الدین نبہؒ بھی خواجہ اجل سرزی کے مرید تھے، مگر یہ ہرگز شمس العارفین کے پوتے یا نواسے نہیں تھے، بلکہ حضرت شمس العارفین کے آزاد کردہ غلام تھے، حضرت بابا صاحبؒ کی ملاقات نبیرگانِ شمس العارفین میں سے جن بزرگ سے ہوئی تھی وہ ہرگز مولانا حسام الدین نبہ نہ تھے، کوئی اور بزرگ تھے جو بخارا کی حدود میں کسی صومعہ میں معتکف تھے۔

روایت (۴) | حضرت بابا صاحبؒ نے بسبیل تذکرہ فرمایا کہ شیر خاں اوچ اور ملتان کا حاکم تھا، وہ مجھ سے متعلق کچھ ایسا عقیدہ نہ رکھتا تھا جو لائق ذکر ہو، بارہا یہ شعر اس کے متعلق پڑھا گیا ہے

افسوس کہ از حالِ منت نیست خبر ۔۔۔ آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری

(افسوس تجھے میرا حال معلوم نہیں، البتہ جب تجھے میرے حال سے آگاہی ہوگی تو تجھے ملال ہوگا)

کچھ دنوں بعد ہی کفار نے اس شہر پر حملہ کیا، اور لوٹ مار کر کے سب کچھ لے گئے (راحت القلوب ص ۱۶)

شیر خان والی اوچ و ملتان تاتاری یورش کے دوران ۶۶۲ھ میں مارا گیا، اور تاتاری سب کچھ لوٹ کر لے گئے تھے، یہ ذکر اسرار الاولیاء ص ۶۹ اور فوائد الفواد ص ۲۲۰ - ۲۲۱ میں بھی ہے، بیان میں وہی فرق ہے جو مختلف مجالس میں بیان کرنے یا مختلف اشخاص کے بیان کرنے میں ہوا کرتا ہے، یہ واقعہ حضرت بابا صاحبؒ کی حیات کا ہے، ایسا ہی ایک واقعہ حضرت بابا صاحبؒ کی وفات کے بعد بھی پیش آیا تھا جس کا ذکر امیر خورد کرمانیؒ نے کیا ہے، اور جس میں حضرت بابا صاحبؒ کے لاڈلے بیٹے شیخ نظام الدینؒ شہید ہوئے تھے، امیر خورد کرمانیؒ کا بیان یہ ہے:

[1] غیاث اللغات۔

"چوں بعد نقل شیخ شیوخ العالم کفار در دیار اجودھن رسید ند خواجہ نظام الدین از جہت مردی و نہایت دلاوری بحرب کفار پیوست، بعد قتال بسیار شہادت یافتند" (سیر الاولیار ص ۱۹۰ج)

یہ واقعہ دراصل اس شعر سے متعلق ہے جو مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے اسرار الاولیار (ص ۶۹) میں حضرت بابا صاحبؒ کی زبانی نقل فرمایا ہے، اور وہ یہ ہے ؎

درویش بہ شہر نہ بودے اگر مقام گشتے سراسر ہمہ عالم خراب حال

فوائد الفواد کے بیان سے یہ مترشح ہے کہ شیر خاں کے ذکر کے ساتھ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس واقعہ کا ذکر بھی فرمایا تھا جو حضرت بابا صاحبؒ کی وفات کے بعد پیش آیا تھا اور جس میں آپ کے صاحبزادے شیخ نظام الدینؒ شہید ہوئے تھے، اس ذکر سے مدعا کیا تھا، یہی کہ کسی کامل درویش کے اٹھ جانے سے مخلوق کو آفات و بلیات سے دوچار ہونا پڑ جاتا ہے، اس میں کوئی کلام نہیں، اور اگرچہ خواجہ حسن علا سنجریؒ نے بعد ازاں کی پیوندکاری سے حادثۂ اجودھن کو واقعۂ شیر خاں سے علٰحدہ کر دیا ہے، مگر ان کی ایجاز نگاری کی بدولت اس طرح ترتیب پایا اور ضم ہوا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ حادثۂ اجودھن ہی وہ حادثہ ہے جس میں شیر خاں مارا گیا تھا، مگر ایسا نہیں ہے، اس ابہام کے رفع ہونے سے واقعہ کی اصل کیفیت واضح ہو جاتی ہے، اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ابہام ہے تو فوائد الفواد کے بیان میں ہے، راحت القلوب کا بیان اقتضائے حال کے مطابق اور واضح ہے، جس سے راحت القلوب کا اعتماد بحال رہتا ہے، اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود راحت القلوب کے بیانات معتبر ہیں اور راحت القلوب ہی فوائد الفواد کا ماخذ ہے۔

روایت (۵) حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں بدخشاں کی طرف مسافر تھا، اس شہر میں بہت سے اولیاء اللہ تھے، چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ کے نبیسہ (پوتے یا نواسے) شیخ عبد الواحد بھی شہر کے باہر ایک غار میں رہتے تھے، جب میں نے یہ سنا تو میں اس غار کے پاس پہونچا اور دیکھا کہ وہ بزرگ نہایت زار و نزار

اور لاغر و کمزور ہیں، ایک پیر اُن کا غار کے اندر ہے اور دوسرا باہر کٹا پڑا ہے، ایک ہی پیر پر وہ عالم تحیر میں کھڑے ہیں، میں ان کے پاس گیا، سلام کیا، انھوں نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا: بایست بایست یہی چاہیے یہی چاہیے (آپ کھڑے تھے، آپ فرماتے ہیں کہ) میں بھی تین رات دن کھڑا ہی رہا، مگر وہ میری طرف متوجہ نہ ہوئے، تین دن کے بعد عالم صحو میں آئے، ہوشیار ہوئے اور فرمایا کہ اے فرید! میرے پاس نہ آؤ، اگر آؤ گے تو جل کے خاک ہو جاؤ گے اور دور بھی نہ رہو ورنہ مہجور ہو جاؤ گے (دور ہی رہو گے، وصل الٰہی نصیب نہ ہوگا) لیکن میری کہانی سنو، ستر سال سے میں اس غار میں کھڑا ہوں، میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ کہیں جا رہی ہے، میرا دل مائل ہوا، میں نے باہر نکلنا چاہا، ہاتف غیب نے کہا کہ وعدہ تو یہ تھا کہ میرے سوا کسی طرف مائل نہ ہوگے، چھری میرے پاس تھی، میں نے اس پیر کو کاٹ کر باہر پھینک دیا، کیونکہ وہ خواہش نفسانی سے باہر نکلا تھا، اب کوئی تیس برس سے، جو ستر سالہ عمر ہی میں شامل ہے، عالم تحیر میں ہوں، اور ڈرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا .... (راحت القلوب ص ۱۰۶)

حکایت طویل ہے، مدعا تنہا بیان سے واضح ہے کہ یہ واقعہ محیر العقول ہے۔ گر عہد وسطیٰ کے سفر میں اکثر سیاحوں کو ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہا ہے، تردد بیجا سے کچھ حاصل نہیں، ایسے اتفاقات بھی اس عہد کے تارک الدنیا بزرگوں سے مختص ہیں کہ بعض نے جذبۂ ندامت سے مغلوب ہو کر اپنے کو جسمانی تکالیف میں مبتلا کر لیا ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے بھی ایسے واقعات بیان فرمائے ہیں، حالانکہ انھیں نہ اس نوعیت کے سفر سے واسطہ پڑا اور نہ انھوں نے بیرونی ممالک کے سفر کیے، مگر پھر بھی ایسے واقعات نقل فرمائے ہیں، مولانا حمید قلندرؒ نے لکھا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا:

(۱) ایک بزرگ نے جذبۂ ندامت سے مغلوب ہو کر دونوں پیر کاٹ ڈالے تھے (خیر المجالس ص ۲۶۵)

(۲) ایک بزرگ نے لذت ذائقہ کی سزا دہی میں زبان چبا لی تھی۔ (" ص ۲۶۸)

(۳) ایک بزرگ نے بازار میں ایک عورت کو دیکھا اور دیکھنے کے جرم میں ایک آنکھ نکال پھینکی تھی۔ (" ص ۲۵۲)

محیر العقول واقعات راحت القلوب ہی سے مخصوص نہیں، ان کتب ملفوظات میں بھی ہیں جو نہایت درجہ مستند سمجھے جاتے ہیں، جن میں سے ایک خیر المجالس بھی ہے، نیز یہ تصور کہ ہمارے مشائخ متقدمین نے جوگیوں اور سنیاسیوں کے مٹھوں میں حاضری دی ہے، اور ان کی تعلیمات سے مستفید ہوئے ہیں، اور یہ واقعات اسی استفادہ کا ثمرہ ہیں، اور سراسر غلط ہے (ومشائخنا بریئون عن ھذہ التھمۃ) بلکہ یہ تصور ہی احساس کمتری اور سیکولرزم کی نا روا فوقیت سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے جو قطعاً خلاف واقعہ ہے، دراصل ان اعمال کا منبع طبیعت کی لینت، گدازی اور خشیت ربی ہے، یہ روایت بھی خرق عادت ہونے کے باوجود وہی مقام رکھتی ہے جو خیر المجالس کی روایات کا مقام ہے، اگر خیر المجالس نہایت درجہ مستند ہے تو راحت القلوب اس سے کہیں زیادہ مستند ہے، جو اس سے ایک صدی پہلے کی یادگار ہے (باقی)

حضرت مسیحؑ کے بعد
نصرانیت کا نیا قالب

از ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

نصاریٰ کی گمراہی کے اسباب

نصاریٰ کے مشرکانہ عقائد کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم و ہدایت کے برعکس اور ان کی سخت ممانعت کے باوجود آخر ان کے پیرو توحید اور دین حق سے برگشتہ ہوکر کفر و شرک کی خباثت میں کیوں پڑ گئے؟ اس کی متعدد وجہیں ہیں:

(۱) اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت مسیحؑ کے زمانہ کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے، ان سے پیشتر کا زمانہ بنی اسرائیل کی طوائف الملوکی اور سخت ابتری و انتشار کا زمانہ تھا، حضرت سلیمانؑ کے بعد ہی سے ان کی سلطنت زوال پذیر ہوگئی تھی اور وہ شدید اختلاف اور باہمی خانہ جنگی میں مبتلا تھے ۴۰۰ سنہ ق م سے وہ مختلف بادشاہوں کے زیر نگیں رہ کر غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ۱۶۵ ق م میں سوریا کے بادشاہ انیتوکس ایپی فلنس نے بخت نصر ہی کی طرح ان کا قتل عام کیا، اور تورات کے سب نسخے جلا دیے، اس کا زمان تھا کہ جس کے پاس عہد عتیق کا کوئی نسخہ ملے گا اور جو شریعت کی رسمیں بجا لائے گا، وہ مار ڈالا جائے گا، مکابیوں کی کتاب میں ہے:

"اور شریعت کے جتنے طومار پائے جاتے تھے، وہ پھاڑ کر آگ میں جلا دیے جاتے تھے، اور

جس کے پاس اس عہد کا طومار پایا گیا یا جو شریعت پر عمل کرتا تھا، وہ شاہی فرمان کے مطابق قتل کر دیا جاتا تھا اور اسی طرح اسرائیل کے ان لوگوں کے ساتھ جو شہروں میں پکڑے جاتے تھے، ماہ بماہ سختی سے سلوک ہوتا رہا، مہینے کی پچیسویں تاریخ میں اس بھینٹ گاہ پر جو مذبح پر بنائی ہوئی تھی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔" (مکابین ۱: ۵۶ - ۶۱)

یہوداہ مکابی نے اسوری حکمرانوں کا خاتمہ کر کے فلسطین کے ایک بڑے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا، اس کی بدولت یہودی حکومت قائم ہوئی اور بیت المقدس کو آزادی نصیب ہوئی، لیکن یہودیوں کی ریشہ دوانی سے جلد ہی سنہ ۶۳ء میں اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور رومی حکمراں ٹیٹس نے یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے لاکھوں یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے دور میں بنی اسرائیل کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی، اور ان میں سیاسی استحکام بھی بالکل مفقود ہو چکا تھا، یہودیوں کی بڑی تعداد بابل میں اسیری اور جلاوطنی کے بعد فلسطین واپس آ گئی تھی، مگر اب بھی ان کی اکثریت بابل ہی میں تھی اور یروشلم رومی حکومت کا ایک صوبہ ہو گیا تھا، اور اس کی جانب سے ایک رومی فرماں روا یہاں کا حاکم مقرر کیا جاتا تھا، حضرت مسیحؑ کی ولادت کے وقت اگسٹس سیزر روم کا فرماں روا تھا اور اس کی جانب سے ہیروڈیس یہودیہ کا حکمراں تھا، اگسٹس کے بعد طائبرس فرماں روائے روم ہوا اور ہیروڈیس اعظم کے انتقال کے بعد اس کی حکومت اس کے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی، اس کا ایک لڑکا زبردستی اس علاقہ کا بھی بادشاہ بن بیٹھا، اس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰؑ کا سر قلم کرا کے ایک تھال میں اسے پیش کیا تھا۔[۱]

سیاسی خلفشار اور عدم استحکام کے اس دور میں شرک و بت پرستی کا بھی بڑا زور تھا، روم و یونان کفر و شرک کا خاص مرکز تھے، یہاں کے لوگ ہیکلوں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے، ان ہی حالات میں

[۱] متی (۱۴: ۳ - ۱۲)

حضرت مسیحؑ نے توحید اور خدا پرستی کی دعوت دی، وہ اصلاً بنی اسرائیل کی اصلاح اور شریعت موسویؑ کی تجدید و تکمیل کے لیے مبعوث کیے گئے تھے،[۱] قرآن مجید میں ہے:

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ ۔ اور (اللہ مسیحؑ کو) بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ (آل عمران: ۴۹)

اس سے معلوم ہوا کہ ان کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے خاص تھی، انجیل میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لیے آئے تھے۔

"ان بارہ کو یسوعؑ نے بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ پہلے اسرائیل کے گھرانہ کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ۔"[۲]

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"مسیحؑ نے اسرائیل کے باہر اپنے مرید تلاش نہیں کیے ․․․․ اولین شاگردوں کو تعلیم مسیحؑ کی عالمگیری کا احساس نہ ہوا۔"[۳]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے روم و یونان کے بت پرستوں سے تعرض کرنے کے بجائے اپنی تعلیم و ہدایت کا دائرہ بنی اسرائیل ہی تک محدود رکھا۔

باوجودیکہ بنی اسرائیل اپنے پُر آشوب حالات کی وجہ سے خدا کی طرف سے ایک نجات دہندہ کے منتظر تھے جو انھیں غلامی کی زندگی سے چھٹکارا دلا کر پھر خدا کی بادشاہت میں داخل کر دے، مگر انھوں نے حضرت مسیحؑ کی تعلیم و ہدایت پر کوئی دھیان نہ دیا، بلکہ اپنی مستقل عادت کے مطابق ان کی شدید مخالفت کو اپنا شعار بنا لیا:

كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ جب جب ان کے پاس آیا کوئی رسول ایسی

[۱] الملل والنحل شہرستانی ج ۲ برحاشیہ ص ۴۸ و ۴۹ برحاشیہ الملل والنحل ابن حزم [۲] متی ۱۰: ۵، ۶ [۳] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۵ ص ۶۳۱-۶۳۲

اَنفُسُهُمْ فَرِیْقًا کَذَّبُوْا وَفَرِیْقًا یَقْتُلُوْنَ ۔ (مائدہ : ۷۰)

بات لے کر جو ان کی خواہش کے خلاف ہوتی تو ایک گروہ کی تکذیب کی اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے ۔

اس کے علاوہ انھوں نے رومی حکومت کو بھی حضرت مسیحؑ کے خلاف بھڑکانا شروع کیا، ابتداء میں رومیوں نے اس کو یہود اور حضرت مسیحؑ کا گھریلو اختلاف سمجھ کر نظر انداز کیا اور اس میں کوئی دخل دینا پسند نہیں کیا، مگر یہود کی مسلسل ریشہ دوانیوں کی وجہ سے رومی حکمراں حضرت مسیحؑ کے مخالف ہو گئے، چنانچہ ہیرودلیس اعظم کا بیٹا ان کے قتل کے درپے ہوا، یہ ٹائرس کا دور تھا، اس کے عہد میں یہودیوں کے اصرار پر پلاطوس نے ۲۹ءمیں حضرت مسیحؑ کو پھانسی دینے کا حکم دیا تھا۔

یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ حضرت مسیحؑ کی دعوت توحید اور شرک و بت پرستی کے خلاف ان کی مہم کو کس قدر سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا اور کیوں وہ اپنی اعجاز پروری اور مسیحا نفسی کے باوجود بنی اسرائیل کے عقائد و اعمال کی اصلاح و تصحیح کا کام خاطر خواہ طور پر انجام نہیں دے سکے۔

حضرت مسیحؑ کے بعد ان کے مخلص اور جاں نثار حواریوں نے نصرانیت کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا مقصد زندگی قرار دیا، وہ توحید، رشد و خیر اور امن و سلامتی کا پیغام پہونچانے کے لیے نہایت مستعدی سے اٹھے، لیکن سخت جد و جہد اور غیر معمولی سعی و جانفشانی کے باوجود لوگوں کو اپنی دعوت قبول کرنے پر آمادہ نہیں کر سکے، کیونکہ ایسے ماحول اور حالات میں عام طبیعتوں کا رجحان شرک و بت پرستی کی جانب زیادہ ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدا ہی میں اس نصرانیت کو فروغ نصیب نہ ہو سکا جس کی بنیاد توحید اور خدا پرستی پر تھی، اور جو دنیا سے کفر و شرک کو مٹانا اور یہودیوں کے گمراہ کن عقائد و اعمال کی اصلاح و تصحیح کرنا چاہتی تھی، بلکہ وہ خود بھی کفر و شرک کی زد سے محفوظ نہ رہی اور آہستہ آہستہ اس کی

آلودگیوں میں پڑتی گئی، اور جو لوگ نصرانیت قبول بھی کر لیتے تھے ان میں بھی شرک و بت پرستی کے اثرات موجود رہتے تھے، کیونکہ یہ اثرات اس قدر جڑ پکڑے ہوئے تھے کہ نصرانیت کا اثر بہت جلد محو اور زائل ہو جاتا تھا اور اصل مشرکانہ خیالات و اثرات بدستور باقی اور برقرار رہتے تھے۔

(۲) نصرانیت کی روح کو مسخ کرنے اور اس میں مشرکانہ عقائد و تصورات شامل کرنے کی ابتداء ایک مشہور یہودی عالم ساؤل نے کی، اس کو حضرت مسیحؑ کا زمانہ ضرور ملا، مگر اس نے ان سے کبھی ملاقات نہیں کی، بلکہ شروع میں وہ نصرانیت اور حضرت مسیحؑ کا شدید مخالف تھا، نیز وہ آپ کے تبعین پر ظلم ڈھانے میں بھی پیش پیش رہتا تھا، مگر آپ کے بعد اچانک اس پر آپ کی تجلی نمودار ہوئی اور اس نے نصرانیت قبول کر لی، خود اس کا بیان ہے کہ

"ہاں میں نے یہی سمجھا کہ یسوع ناصری کے نام کی ہر طرح مخالفت کرنا مجھ پر واجب ہے، میں نے یروشلم میں ایسا ہی کیا اور سردار کاہنوں سے اختیار پا کر بہت سے مقدسوں کو قید میں بند کیا، اور جب وہ قتل کیے جاتے تھے تو میں ہامی بھرتا تھا، اور ہر عبادت خانے میں انھیں سزا دلا کے زبردستی ان سے کفر کہلواتا تھا، بلکہ ان کی مخالفت میں ایسا دیوانہ بنا کہ غیر شہروں میں بھی جا کر انھیں ستاتا تھا، اسی حال میں سردار کاہنوں سے اختیار اور پروانے لے کر دمشق کو جاتا تھا، ایک روز دوپہر کو میں نے راہ میں دیکھا کہ آسمان سے ایک نور سورج سے زیادہ روشن میرے اور میرے ساتھیوں کے گرد چمکتا ہے، جب ہم سب زمین پر گر پڑے تو میں نے عبرانی زبان میں یہ آواز سنی کہ اے ساؤل! اے ساؤل! تو مجھے کیوں ستاتا ہے، پینے کی کیل پر لات مارنا تیرے لیے مشکل ہے، میں نے کہا، اے خداوند! تو کون ہے؟ خداوند نے فرمایا میں یسوع ہوں جسے تو ستاتا ہے، لیکن اٹھ اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو، کیونکہ میں اس لیے تجھ پر ظاہر ہوا کہ تجھے ان چیزوں کا خادم اور گواہ ٹھہراؤں جنھیں تو نے دیکھا، اور ان کا بھی جن میں تجھ پر ظاہر کروں گا اور میں تجھے اس قوم اور غیر قوموں سے بچاؤں گا جن کے پاس اب تجھے بھیجتا ہوں کہ تو ان کی آنکھیں

کھول دے، تاکہ اندھیرے سے اجالے اور شیطان کے اختیار سے خدا کی طرف رجوع ہوں اور مجھ پر ایمان لانے کے باعث گناہوں کی معافی اور مقدسوں میں شریک ہوکر میراث پائیں۔" (اعمال ۲۶: ۹ تا ۱۹)

اس واقعہ کے بعد وہ خداوند یسوع پر ایمان لایا اور عبادت خانوں میں منادی کرنے لگا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے:

"اس نے یروشلم پہونچ کر شاگردوں میں مل جانے کی کوشش کی، پر سب اس سے ڈرتے تھے، کیونکہ ان کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ شاگرد ہے، مگر برنباس نے اسے اپنے ساتھ رسولوں کے پاس لے جاکر ان سے بیان کیا کہ اس نے راہ میں کس طرح خداوند کو دیکھا اور اس نے اس سے باتیں کیں، اور اس نے دمشق میں کیسی دلیری کے ساتھ یسوعؑ کے نام سے منادی کی۔ پس وہ یروشلم میں ان کے ساتھ آتا جاتا رہا، اور دلیری کے ساتھ خداوند کے نام کی منادی کرتا تھا، اور یونانی یہودیوں کے ساتھ بحث و گفتگو بھی کرتا تھا، مگر وہ اسے مار ڈالنے کے درپے تھے، جب بھائیوں کو یہ معلوم ہوا تو اسے قیصریہ میں لے گئے، اور ترسوس کی طرف روانہ کردیا۔" (اعمال ۹: ۲۶ تا ۳۰)

برنباس کی تصدیق کے بعد اکثر حواریوں نے بھی ساؤل کی تصدیق کی اور اس نے اپنا نام بدل کر پولس (پال، Paul) رکھا، اور حواریوں کے ساتھ مل کر نصرانیت کی تبلیغ کرنے لگا، اس کی لیاقت وصلاحیت اور مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں نصرانیت کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا، اور غیر یہودی بھی اسے قبول کرنے لگے، پال اپنی ان خدمات اور سرگرمیوں کی بنا پر حضرت مسیحؑ کے متبعین میں بہت مقبول ہوگیا، اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے بہ تدریج نصرانیت میں نئی نئی باتیں داخل کرنی شروع کیں، چنانچہ حضرت مسیحؑ کی ابنیت، الوہیت، کفارہ اور حلول وغیرہ کے مشرکانہ عقائد کو اس کا جزء بنا دیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

"اور بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے

بدعات کی خاک میں اصلی عیسویت ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئی، اور باپ بیٹے اور روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہوگیا، اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰؑ بھی مٹا نہیں سکتے تھے، وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی" (سیرۃ النبی ج ۴ ص ۲۱۸)

پال نے فلسفیانہ ترکیبیں اور اصطلاحات وضع کیں اور نصرانیت میں یونانی فکر و فلسفہ کی آمیزش کرکے اسے ایک نئی صورت میں تبدیل کردیا، اس طرح اصل مسیحی تعلیمات مسخ ہوگئیں اور یونانی فلسفہ اور دوسرے مذاہب کے مختلف عناصر کا ایسا ملغوبہ تیار ہوا جس کو حضرت مسیحؑ کی اصل دعوت سے کوئی مناسبت نہ تھی، بلکہ یہ یونانیوں، مصریوں اور آشوریوں کے عقائد و افکار سے زیادہ قریب تر تھا۔

پال خود یونانی یہودی تھا، اور وہ فلسفۂ روم و یونان پر دسترس رکھتا تھا، اس زمانہ میں رومیوں کی حکومت تھی، جسے یونانی حکومت و تہذیب کا جانشین خیال کیا جاتا تھا اور یونانی تہذیب میں مظاہر پرستی کا بڑا غلبہ تھا، پال کی تعلیمات میں بھی اس کا بہت عمل دخل تھا، اس نے یروشلم میں دوسرے حواریوں سے مل کر یہ بھی طے کرایا کہ شریعت موسوی کے احکام پر عمل کرانے کے لیے غیر یہودیوں (جنٹائلز) پر نہ تو سختی کی جائے اور نہ انھیں زبردستی ان کا مکلف بنایا جائے، چنانچہ اس نے انھیں ختنہ نہ کرانے اور سور کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی، تاریخ شام کا مصنف ہٹی لکھتا ہے:

"پال کی رہنمائی میں ایسا انتظام ہوا کہ نصرانیت اور یونانی تہذیب کے درمیان مصالحت ہوگئی، اس طرح نصرانیت پر یونانی رنگ چڑھ گیا اور وہ رومیوں اور یونانیوں کے لیے قابل قبول ہوگئی۔"

(تاریخ شام ص ۲۶۵ بحوالہ الوعی الاسلامی الکویت)

جب تک پال نے اپنے نظریات واضح طور پر پیش نہیں کیے تھے، اس وقت تک تو حضرت مسیحؑ کے حواری اور سچے خلفاء بھی اس کے ساتھ تھے، لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ وہ نصرانیت کی اصل تعلیمات سے منحرف ہوتا جارہا ہے تو وہ اس سے کنارہ کش ہوگئے، انھوں نے پال سے بڑے مباحثے اور مناظرے بھی کیے، لیکن

اس کی بدعات اور اضافے رومیوں کے مذاق کے تھے اس لیے بالآخر انھوں نے اصل نصرانیت کو چھوڑ کر پال کا خود ساختہ جدید عیسائی مذہب قبول کر لیا، علاوہ ازیں اس نے چونکہ نصرانی تعلیمات میں یونانی و رومی افکار کی آمیزش کر دی تھی، اور لوگوں کے لیے ہر طرح کی رعایتیں اور سہولتیں بھی پیدا کر دی تھیں، اس لیے اس کا خود ساختہ مذہب تیزی سے مقبول ہوا، اور وہ غیر یہودیوں کے لیے بھی بہت پرکشش ہو گیا، اس لیے وہ بھی نہایت رغبت سے اس میں داخل ہونے لگے۔

پال بڑا زیرک اور فہیم تھا، اس نے اپنی دانشمندی سے عیسائی مذہب کی ایسی تعبیر کی جو یونانی و رومی مذہب کے بہت زیادہ موافق تھی، اس نے حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کو مسخ کر کے ان میں بت پرستی کی آمیزش اسی لیے کی تھی کہ اس وقت کا پورا ماحول بت پرستانہ تھا، لوگ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے تھے، ڈریپر لکھتا ہے:

"مشرق میں اوتاروں نے اور مغرب میں انسانوں نے دیوتاؤں کا روپ دھار کر اولمپس کی ربانی آبادی کو بہت جلد جلد بڑھانا شروع کر دیا تھا، ایشیا کا اگر یہ قاعدہ تھا کہ دیوتا آسمان سے اتر کر انسانی قالب میں بروزی رنگ کے اندر ظاہر ہوتے تھے تو یورپ میں انسان زمین سے صعود کر کے آسمان پر چلا جاتا تھا اور دیوتاؤں کے زمرہ میں شریک ہو جاتا تھا۔" (معرکۂ مذہب و سائنس ص ۴۹)

ایسے ماحول میں اصل مسیحی تعلیمات کو پھیلنے میں دیر اور تاخیر ہوتی، اس نے اپنے مذہب کی جلد از جلد اشاعت کے لیے اس کی روح ختم ہو جانے کی بھی پروا نہ کی، اس دھن میں اس نے اسے ایک نیا قالب دے دیا اور اس پر یونانی رنگ چڑھا کر اس میں کفر و شرک کے اثرات داخل کر دیے، اس کے نتیجہ میں اس کا مذہب تیزی سے پھیلا، برٹن لکھتا ہے:

"مسیحیت اس وجہ سے بھی کامیاب ہوئی کہ اس میں بت پرستی کی بہت سی چیزیں شامل تھیں، یعنی وہ کامل نئی چیزیں نہ تھیں۔"

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ عیسائیت[1] کو حضرت مسیحؑ کی جانب منسوب کرنا درست نہیں ہے۔

---

[1] یہاں عیسائیت اور نصرانیت کے متعلق مختصر وضاحت کر دینا مناسب ہوگا، نصاریٰ نصران کی جمع ہے، شروع میں حضرت مسیحؑ کے ماننے والے نصاریٰ ہی کہلاتے تھے، اور متقدمین اس نام کو پسند کرتے تھے لیکن متاخرین نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا، وہ دو فرقوں میں بٹ گئے، ایک نے خلیفۂ برحق شمعون (پیٹر) کی پیروی کی، یہی فرقہ نصاریٰ کہلایا، دوسرے فرقہ نے پال کی پیروی کی، موجودہ عیسائی اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، یہ لوگ نصاریٰ کو تحقیر کا لفظ سمجھتے ہیں ان کے خیال میں یہ ایک معمولی اور حقیر گاؤں ناصرہ کی طرف نسبت ہے، جو علاقہ گلیلی میں بیت المقدس سے ستر میل شمال اور بحر روم سے بیس میل مشرق میں واقع ہے، اس کی موجودہ آبادی آٹھ نو ہزار ہے، بعض محققین کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کا آبائی وطن یہی ہے، اور آپ اسی کی نسبت سے یسوع ناصری کہلاتے ہیں نتن ایل نے اس سے کہا کیا ناصرت سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے۔" (یوحنا ۱: ۴۵ - ۴۶)

آخر ناصرہ کی طرف منسوب ہونے میں حقارت کا کون سا پہلو ہے، جبکہ ان لوگوں کا بھی دعویٰ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش ہے، اور یہ کہ وہ ناصری کے لقب سے پکارے جائیں گے، انجیل میں ہے:

"اور ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا، جا کے رہا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔" (متی ۲: ۲۳)

قرآن کے بعض مخالفین کہتے ہیں کہ اسے نصاریٰ کی وجہ تسمیہ کا پتہ نہیں، اس وجہ سے کہ نصاریٰ نصرت سے ماخوذ ہے، اور سورۂ صف میں اسی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے:

كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ، قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ۔	جیسے عیسیٰ ابن مریمؑ نے حواریوں سے کہا کہ کون ہیں جو خدا کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں گے؟ حواریوں نے کہا: ہم خدا کے مددگار ہیں۔

(صف: ۱۴)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۸ پر)

اس کا اصل بانی پال ہے، اسی نے نصرانیت کو مشرکانہ اعمال، رسوم اور عقائد کا مجموعہ بنایا، نصاریٰ کی حیثیت شروع میں یہود کے ایک اصلاح یافتہ فرقہ کی تھی، حضرت مسیحؑ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ اپنے پیرووں کو ان ہی شرائع و قوانین کی پیروی کا حکم دیتے تھے جو توریت میں موجود تھے، البتہ انھوں نے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۷) : یہ اعتراض قرآن کے مفہوم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اس کا مقصد نصاریٰ کی وجہ تسمیہ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ نصاریٰ کے دو گروہوں میں سے پہلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، قرآن نے ان ہی لوگوں کی تعریف میں کہا ہے:

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ.	اور تم اہل ایمان کی دوستی سے ان لوگوں کو قریب تر پاؤگے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔
(مائدہ : ۸۲)	

پس قرآن کا ممدوح گروہ وہ ہے جو نصاریٰ کہلایا، وہ نصرانی اور عیسائی یا نصرانی اور مسیحی میں فرق کرتا ہے، مسیحی اناجیل اربعہ پر ایمان رکھتے ہیں اور مسیحؑ کو خدا کا نبی نہیں بلکہ اس کا بیٹا مانتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ خدا ان کے قالب میں حلول کر آیا تھا، وہ آخرت میں نجات دینے والا خدا کو نہیں، حضرت مسیح ابن اللہ کو یقین کرتے ہیں، اور خدا کو تین اقنوم میں تقسیم کر کے ایک ناقابل فہم فلسفہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر اقنوم بجائے خود ایک خدا ہے اور تینوں اقنوم مل کر بھی ایک ہی خدا بنتے ہیں، مگر نصاریٰ ابتداءً حضرت مسیحؑ کے سچے پیرو تھے، اور ان کو نبی مانتے تھے، یہ توحید کے قائل اور اناجیل اربعہ کے بجائے صرف انجیل متی پر ایمان رکھتے تھے، جب مشرکانہ عقائد کے اثرات سے اصل عیسائیت مسیحیت حلول و تثلیث سمجھی جانے لگی تو نصرانیت ناپید ہوتی گئی اور عیسائیت کا بول بالا ہوتا گیا جو تمام تر پال کی تعلیمات پر مبنی ہے، قرآن نے کہیں بھی اس کی مدح و تحسین نہیں کی ہے، بلکہ ہر جگہ مذمت کی ہے۔ (مفردات القرآن مولانا حمید الدین فراہی، ص ۶۹ و ۷۰) ڈریپر بھی لکھتا ہے: "سیاسی معنوں میں عیسائیت وہ ترکہ ہے جو سلطنت روتہ الکبریٰ نے دنیا کے لیے چھوڑا۔" (معرکۂ مذہب و سائنس ص ۴۷ و تفسیر ماجدی)

یہود کی تحریف کو درست کیا، اور ان کی بدعات کی اصلاح کی، ان کے خلفاء کا طرزِ عمل بھی یہی رہا، ڈریپر کا بیان ہے:

"سالہا سال تک مذہب عیسوی صرف تین اصولوں کی تلقین کرتا رہا، یعنی حق اللہ، حق الذات اور حق العباد، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ خدائے بزرگ و برتر کی تعظیم و تکریم کرے، ذاتی طور پر نیک اور پاکباز ہو اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ بھلائی کرے۔"

(معرکۂ مذہب و سائنس ص ۵۲)

مگر پال نے نصرانیت کا ڈھانچہ ہی بدل دیا اور نصاریٰ کو ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممیز کیا، اور غیر بنی اسرائیل کے لیے توریت کی پابندی منسوخ کر دی، حضرت مسیحؑ کے سچے پیرووں نے اس پر اس سے بڑی رد و کد کی، مگر پال کی عوامی مقبولیت کے سامنے وہ بے بس رہے، پال کے اس خود ساختہ عیسائی مذہب کو نہ اصل انجیل سے کوئی واسطہ ہے اور نہ تورات سے، بلکہ اس کو ماننے والے خدا کے بجائے اپنے علماء و اکابر کی بدعتوں کے پیرو ہیں، حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت مسیحؑ کی بعثت بھی اسی دین الٰہی کی دعوت دینے کے لیے ہوئی تھی جس کی دعوت دینے کیلئے ان سے پہلے کے انبیاءؑ مبعوث کیے گئے تھے، پس انھوں نے خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت و بندگی کی تلقین کی اور ماسوا کی عبادت سے منع کیا، رومی اور یونانی مشرک اور بت پرست تھے، وہ آسمانی ہیکلوں اور زمین کے بتوں کی پوجا کرتے تھے، حضرت مسیحؑ کی زندگی میں ان کے بعض تلامذہ ان لوگوں کو خدائے واحد کے دین کی دعوت دینے کے لیے پہونچے اور بعض سفراء آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد وہاں گئے، ان کی دعوت و تبلیغ سے کچھ لوگوں نے اللہ کے دین کو قبول کر لیا اور وہ ایک مدت تک اس پر قائم رہے، لیکن پھر شیطان نے بعض لوگوں کو ورغلایا، جس کے نتیجہ میں وہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے، اور ان کے دین کو تبدیل کر کے ایک ایسا دین

ایجاد کیا، جو حضرت مسیحؑ کے دین اور مشرکین کے دین کا معجون مرکب تھا، پس یہ مشرکین اور بت پرستوں کا دین تھا اور رومیوں، ایرانیوں، نیز فلاسفہ کا دین تھا۔" (الجواب الصحیح ج ۱ ص ۱۱۹ و ۱۲۰)

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

"نصاریٰ نے ایک نیا عقائد نامہ ایجاد کیا، جس کا انبیائی تعلیمات میں وجود نہیں، نہ حضرت مسیحؑ اور نہ کسی دوسرے نبی کے کلام میں کہیں اللہ کے اقانیم کا ذکر ملتا ہے، نہ تین کا، نہ زیادہ کا، نہ کہیں صفات ثلاثہ کا ثبوت ہے، نہ کہیں کسی صفت الٰہی کو ابن اللہ یا رب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ اللہ کی حیات کو روح کہا گیا ہے، اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا ایک فرزند ہے جو الٰہ حق ہے اور الٰہ حق سے وجود میں آیا ہے، وہ اپنے باپ کے جوہر سے ہے، اور وہ بھی اسی طرح خالق ہے جیسے کہ اللہ خالق ہے۔ اور اسی طرح کے دوسرے اقوال جو کلمات کفر پر مشتمل ہیں کسی نبی سے بھی منقول نہیں۔ (الجواب الصحیح ج ۳ ص ۱۴۴)

نصاریٰ نے دو دینوں کی آمیزش سے ایک دین ایجاد کیا، ایک توحید کی دعوت دینے والے خدا کے پیغمبروں کا دین تھا، اور دوسرا مشرکین کا دین، اس لیے ان کے دین کا ایک حصہ تو انبیاءؑ کی تعلیمات کا ہے اور دوسرا ان نئے اقوال و افعال کا ہے جو انھوں نے مشرکین کے دین سے لے کر اس میں شامل کیا ہے، اقانیم کے الفاظ ایجاد کیے، جن کا انبیاء علیہم السلام کے کلام میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔[1]"

قسطنطین کے زمانہ سے سلاطین روم نصرانیت کے حامی ہو گئے، اس کے بعد پوپ کے جو احکام روانہ کیے جاتے ان کے متعلق بادشاہ کا یہ فرمان جاری ہوتا کہ ان کی خدائے قادر مطلق کے احکام کی حیثیت سے پیروی کی جائے، شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

"نصاریٰ کے عقائد، احکام اور ان کی شریعت ان کے اکابر و علماء برابر ایجاد و وضع کرتے رہے، چنانچہ قسطنطین بادشاہ کے زمانہ میں تین سو اٹھارہ ۳۱۸ آدمیوں نے وہ عیسائی محضر تیار کیا جس پر مختلف

---

[1] الجواب الصحیح ج ۳، ص ۱۹۹۔

عیسائی فرقوں نے اتفاق کیا، اور اریوس وغیرہ جو اس کے مخالف تھے ان پر لعنت کی گئی، اس محضر میں وہ باتیں شامل ہیں جن کا کسی آسمانی کتاب میں نشان نہیں ملتا، بلکہ تمام آسمانی کتابوں کی مخالف اور عقل صریح کے منافی ہیں۔" (الجواب الصحیح ج ۱ ص ۱۱۸)

اس امر کا اعتراف خود مسیحی علماء کو بھی تھا، ایک فرانسیسی مصور موسیو آٹین ڈینیہ لکھتے ہیں:

"وہ انجیل جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو ان کی اور ان کی قوم کی زبان میں بھیجا تھا اس کے بارہ میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ گم شدہ چیز ہے اور اب اس کا کوئی اثر و نشان بھی باقی نہیں رہ گیا۔" (مسیحیت از متولی یوسف چلپی، اردو ترجمہ ص ۲۵)

ڈاکٹر حافظی محمو فا فرماتے ہیں:

"مسیحیت سے میری مراد وہ ہے جو حضرت مسیحؑ کی تعلیمات اور ان کی تصریحات پر مبنی ہے، نہ کہ وہ جو ان کے کلام اور سیرت میں مابعد کے اضافے اور تاویلیں ہیں۔" (ایضاً ص ۲۶)

ایک جرمن عالم فرونڈ بلیم جو سنہ ۱۸۲۶ء سے سنہ ۱۹۰۲ء تک ٹوبنگن میں الٰہیات کے پروفیسر رہے، وہ تحریر کرتے ہیں:

"عہد جدید کی کتابیں زیادہ تر سینٹ پال کے خیالات کا آئینہ ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ نیقہ کے مشہور اجلاس کے بعد جب مسئلہ تثلیث مسلمہ اصول دین قرار پایا تو حضرت عیسیٰؑ کی پاکیزہ تعلیمات بت پرستوں کے عقائد کے قالب میں ڈھال دی گئیں، گویا روما کے بھیڑیے نے ناصرہ کے برہ کی کھال اوڑھ لی، یعنی بت پرستی عیسائیت کی شکل میں نظر آتی ہے۔" (بحوالہ تاریخ صحف سماوی ص ۶۶)

اور جب اصلی انجیل اور حضرت مسیحؑ کی حقیقی تعلیمات ہی باقی نہیں رہیں تو ظاہر ہے مسیحیت اپنے اصلی قالب میں کیسے باقی رہتی، چنانچہ ڈریپر کا بیان ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ سیویرس کے زمانہ کی عیسائیت اور قسطنطین کے زمانہ کی عیسائیت میں زمین آسمان کا فرق ہے، (ص ۶۱) ..... اس خیال سے کہ بت پرستوں کے دلوں میں شکست نے جو ناسور ڈال دیئے اس کا اندمال مراعات خاص اور نوازشہائے پنہاں سے مرہم سے ضروری ہے، قسطنطین نے اپنے دربار میں بت پرستی کی رسموں کی تجدید و ترویج سے نہ صرف اغماض کیا، بلکہ ان کوششوں کو استحسان کی نظر سے

دیکھا، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کوششوں میں سب سے زیادہ حصہ لینے والے اسی کے خاندان کے ارکین تھے۔ (ص ۶۳) ..... جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، وہ مذہبی عقائد کی تفصیل ڈریلین نے بیان کی ہے، متغیر ہوکر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرنے لگے، ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا، اولمپس تو وہی پہلا سا موجود ہو گیا، مگر دیوتاؤں کے نام بدل دیے گئے، سلطنت کے جن صوبوں کی قوت بڑھی ہوئی تھی، وہاں کے باشندوں نے علی رغم مذہب شاہی اپنے قدیم عقائد اختیار کر لیے، عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا، نہ صرف آئیسس کی پرستش بہ تبدیلی نام از سر نو ہونے لگی، بلکہ اس کا بت بھی جو کسی زمانہ میں ایک ہلالی قوس پر رکھا ہوا نظر آیا کرتا تھا، از سر نو نمودار ہو گیا۔ (ص ۶۵ - ۶۶) ..... فاسٹس نے قیصر اگسٹائن سے برملا ان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا، "تم میں اور بت پرستوں میں کیا فرق رہا، اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تمہاری جماعت علیحدہ ہے اور ان کی جماعت علیحدہ، ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی سے ہیں" (ص ۶۶ - ۶۷) ..... پادری مِیون کا خیال ہے: "کیا آج کل اولیاء و ملائکہ کی پرستش ہر اعتبار سے زمانۂ سابق کی پرستش شیاطین سے مشابہ نہیں ہے، صرف نام کا فرق ہے، باقی سب کچھ یکساں ہے، بت پرست اپنے بزرگوں کو دیوتا سمجھ کر پوجتے تھے، عیسائیوں نے اپنے بزرگانِ دین کو خدا بنا رکھا ہے۔ (ص ۶۹)

(۳) حضرت مسیحؑ کے بعد تین صدیوں تک ان کے متبعین کو سخت حالات اور مشکل دور سے گذرنا پڑا، اس زمانہ میں نصرانی مذہب بہت مغلوب رہا اور حضرت مسیحؑ کی جانب نسبت مجرم ہونے کے مترادف سمجھی جاتی تھی، اسی لیے اس کو نصاریٰ کا دورِ ابتلاء کہتے ہیں، اس دور میں ان پر رومیوں کا سیاسی تسلط تھا اور مذہبی حیثیت سے یہودی ان پر حاوی تھے، علاوہ ازیں خود عیسائیوں کے باہمی شدید اختلافات کی وجہ سے ان کے اندر متعدد فرقے پیدا ہو گئے تھے، تیسری صدی میں حضرت مسیحؑ کی ذات کے متعلق مختلف عقیدے پائے جاتے تھے، چوتھی صدی عیسوی کی ابتداء میں عیسائیوں کی مظلومی کا اس طرح

خاتمہ ہوا کہ ۳۰۶ء میں قسطنطین روم کا بادشاہ ہوا، اس نے عیسائیت قبول کر کے اس کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی دلچسپی لی، کئی بڑے بڑے شہروں میں کلیسا تعمیر کرائے اور عیسائی علماء کو مذہبی تحقیقات کے لیے وقف کر دیا، ان علماء کی مختلف کونسلوں نے باقاعدہ عیسائی عقائد کو مدون و منضبط کر دیا۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ برپا رہتی تھی، رومیوں نے اپنے کو ایرانیوں سے ممتاز اور فائق ہونے کے لیے مسیحی مذہب قبول کر لیا، جس کے خلاف وہ برسوں سے صف آرا تھے، اس بنا پر وہ غور و فکر کے بجائے محض سیاسی مصالح کی بنا پر حلقہ بگوش عیسائیت ہوئے تھے، اس صدی میں رومی حکومت دو حصوں میں بٹ گئی تھی، مشرقی رومی حکومت اور مغربی رومی حکومت، اول الذکر کو بازنطینی حکومت بھی کہا جاتا ہے، اس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا، قسطنطین نے یہ شہر تعمیر کرایا تھا، اور وہی بازنطینی حکومت کا پہلا بادشاہ تھا، وہ بت پرست تھا، اور سیاسی اسباب کی بنا پر عیسائیوں کی حمایت کرتا تھا، اس نے ۳۲۵ء میں ایلیا کو عیسائیت کا مرکز قرار دیا۔

اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ رومیوں کے اندر سے مشرکانہ عادتیں اور رسمیں ختم نہیں ہوئیں، اس بنا پر مسیحیت فلسفہ اور مشرکانہ تصورات کا مجموعہ بن گئی، بلکہ فلسفہ کو شریکِ غالب کی حیثیت حاصل ہو گئی، اس طرح اقانیم ثلاثہ کا عقیدہ عمل میں آیا۔

قسطنطین کے زمانہ کے لوگوں نے بھی عیسائیت کو سچا اور صحیح دین سمجھ کر نہیں قبول کیا تھا بلکہ ان کا اولین مقصد ذاتی اور سیاسی فائدے حاصل کرنا تھا، ڈریپر نے معرکۂ مذہب و سائنس میں زیر بحث مسئلہ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ اب جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے

ملنے لگے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا دار لوگ جنھیں مذہب کی خس برابر بھی پروا نہ تھی، مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہوگئے، چونکہ وہ بظاہر عیسائی، لیکن بباطن مشرک و بت پرست تھے، لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی وشرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہوگئی، قسطنطین نے کہ وہ بھی ان ہی کا ہم مشرب تھا، کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے ان کے اس منافقانہ طرز عمل کا سد باب ہو، قسطنطین کی ساری عمر سیاہ کاریوں میں گذری اور کہیں آخری وقت (۳۳۷ء) میں جاکر اس نے ان مذہبی مراسم کی پابندی کی جن پر عمل کرنے کی کلیسا ہدایت کرتا ہے۔" (معرکہ مذہب و سائنس ص ۵۹)

آگے لکھتے ہیں:

"اس اختلاط (بت پرستی اور مسیحیت) سے جو عظیم الشان نتیجہ مرتب ہوئی اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسیحی جماعت دولتمند ہوگئی اور اس کے سیاسی اقتدار کا پلہ بھاری ہوگیا، سرکاری مالگذاری کی رقم خطیر کا ایک بہت بڑا حصہ کلیسا کے خزانوں میں داخل ہونے لگا، اس دولت پر دست سابقت دراز کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی اور یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دین عیسوی کی حمایت کا جامۂ ریائی پہن کر حقیقت میں اس کے دنیوی فوائد سے مستفید ہونے کو اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔" (ص ۹۲)

مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہوگئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا، مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ، بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہوجاتا، تخت سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا،

اس کے لیے عقائد کی دو لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا فیصلہ کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہوگیا۔" (سیرت النبی ج ۴ ص ۳۱۹)

جب مختلف اشخاص اپنے اپنے ذوق و اغراض کے ساتھ نصرانیت میں داخل ہوئے تو ان کی کشمکش سے اس کے اصل اصول و بنیادی عقائد معدوم ہوگئے اور بت پرستی کے اثرات اس میں شامل ہوگئے، اس امتزاج سے ایک نیا دین وجود میں آیا جو نصرانیت اور یونانی و رومی فلسفہ کا ملغوبہ تھا، مصر کے قبطی النسل عالم و محقق مجدی مرجان لکھتے ہیں:

"اسلام ہی نہیں، آسمانی پیغام کے حامل تمام مذاہب سے نصرانیت کا بنیادی اختلاف اس کی اس گڈمڈ اور بگڑی ہوئی صورت کی وجہ سے ہے، جس کو بت پرستی نے نصرانیت کو ختم کرنے کے لیے اس میں داخل کر دیا ہے۔[۱]

ڈریپر کا بیان ہے:

"دولت روما کی حکمت عملی نے عہد قدیم کی عیسائیت میں بت پرستی کا عنصر ملا کر سلطنت کے باشندوں کو کفار مسیحی نما بنا دیا تھا، بت پرست اور عیسائی بہ لحاظ عقائد ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دونوں فریق ایک دوسرے میں مذہبی طور پر ضم ہوگئے تھے، عیسائیت نے بت پرستی میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی تھیں اور بت پرستی نے عیسائیت کو بہت کچھ متغیر کر دیا تھا، یہ دو غلا مذہب دولت روما کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔" (معرکۂ مذہب و سائنس، ص ۹۲)

عیسائی تاریخ کے اس زریں عہد میں جب ان پر مظالم کا سلسلہ موقوف ہوا، اور قسطنطین کو نصرانیت سے ہمدردی ہوئی تو اس نے اس مذہب کو مستحکم کرنے اور عیسائیوں کے اختلافات ختم کرنے کی غرض سے تمام ممالک کے

---

[۱] بحوالہ مجلہ الوعی الاسلامی کویت۔

کے لوگوں کو بھی گیا، اور ۳۲۵ء کی نیقیہ کونسل میں تثلیث کے عقیدے کو عیسائیت کے بنیادی عقیدے کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا، اور پال نے حضرت مسیحؑ کی ابنیت والوہیت کا جو عقیدہ گھڑا تھا اسے بھی بالاتفاق تقدس کا درجہ دے دیا گیا، گو اس کی مخالفت بھی کی گئی، مگر وہ بے اثر رہی جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

(۴) نصاریٰ کے تساہل اور بے جا رواداری نے بھی نصرانیت میں بت پرستی کو در آنے کا موقع دیا، یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ گو نصاریٰ کی حیثیت یہود کے ایک اصلاح یافتہ فرقہ کی تھی، مگر حضرت مسیحؑ اور ان کے تبعین پر انھوں نے بڑے مظالم ڈھائے، ان مظالم سے تنگ آکر نصاریٰ نے فلسطین کے بجائے یورپ کا رخ کیا، اور یہودی ماحول چھوڑ کر رومی و یونانی بت پرستوں میں نصرانیت کی تبلیغ کرنے لگے، مگر ان کو یہ خوف و اندیشہ برابر لاحق رہا کہ کہیں رومی و یونانی قبائل کی طرف سے بھی ان کو انہی مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑے جن کو وہ یہودیوں کے ہاتھوں جھیلتے رہے ہیں، اس لیے نصرانیت کے داعیوں اور مبلغوں نے اس میں بت پرستی کے اثرات داخل ہوتے دیکھ کر بھی خاموشی اختیار کی اور بت پرستوں کے رسوم و عادات اور طور طریقوں کو گوارا کرنے پر آمادہ ہو گئے، ممکن ہے ان کی نیتیں نیک رہی ہوں اور وہ سمجھتے رہے ہوں کہ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ بت پرستوں کو نصرانی مذہب کے قریب کر سکتے ہیں، حافظ ابن قیمؒ نے بھی اس کی جانب اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"نصاریٰ نے جب اپنے صحیح دین کو کھو دیا، اور دوسرے مذاہب نیز اہل فلسفہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو نصرانی اصول و احکام میں ایسی لچک پیدا کرنا شروع کر دیا کہ ہر مذہب و مسلک کے لوگوں کے لیے ان کے دین میں گنجایش نکل سکے، چنانچہ یہ دیکھ کر کہ فلاسفہ عقل، عاقل اور معقول کے اتحاد کے قائل ہیں انھوں نے بھی باپ بیٹے اور روح القدس کا نقشہ اپنے یہاں تیار کر لیا۔" (اغاثۃ اللہفان ص ۳۷۲)

ان کو یہ خوش فہمی بھی تھی کہ امتداد زمانہ سے کفر و شرک کی آلایشیں خود بخود دور ہو جائیں گی، اور غلط رسوم و عادات اور نامناسب طور طریقوں کا خاتمہ ہو جائے گا، اور نصرانیت مشرکانہ اعمال و عقائد سے پاک ہو کر

اپنی اصلی اور صحیح حالت پر لوٹ آئے گی، لیکن عملاً اس کے برعکس ہوا۔

اس مداہنت اور رواداری کا یہ اثر ضرور ہوا کہ بت پرست قبائل کا میلان نصرانیت کی جانب ہو گیا، لیکن انھوں نے اپنے رسم و رواج، بت پرستی کے طور طریقے اور مشرکانہ عقائد و تصورات بھی اس کی طرف منتقل کر دیے، جن کی طرف سے نصرانیت کے داعیوں نے پہلے وہلہ میں چشم پوشی برتی اور اغماض سے کام لیا، تاکہ بت پرست نصرانیت سے بیزار نہ ہو جائیں، آیندہ ان کی اصلاح ہو جائے گی، اور وہ عقیدۂ صحیحہ اور توحید خالص پر راسخ و استوار ہو جائیں گے، لیکن ان کی توقعات کے برعکس بت پرستوں کے طور طریقے اور مذہبی شعائر و رسوم خود عیسائیت پر اس طرح غالب آ گئے کہ اس پیغام کی روح ہی محو اور مسخ ہو گئی جس کو لے کر سیدنا مسیحؑ دنیا میں تشریف لائے تھے، چنانچہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ احکام الٰہی میں تغیر و تبدل ہونے لگا، اور ان کی جگہ انسانوں کے احکام و قوانین نصرانیت کا جزو بنتے گئے، حقایق مغلوب ہو گئے اور اوہام و خرافات کے راستے کھل گئے، غرض وہ مداہنت پسندانہ رویہ جو بت پرستوں کے مقابلہ میں نصرانی مبلغوں نے اختیار کیا تھا، وہی وثنیت اور شرک کے اس پر غالب آنے کا سبب بن گیا، اور اسی نے اسے بت پرستی کی راہ پر گامزن کر دیا، پروفیسر نواب علی لکھتے ہیں:

"ابتدا میں حواریوں کا دائرہ تبلیغ صرف یہود اور ان کے شہروں تک محدود رہا لیکن جس وقت پال جو پہلے دین عیسوی کا سخت دشمن تھا، اور حواریوں اور ان کے تبعین کو سخت اذیتیں دیا کرتا تھا تائب ہو کر حلقہ میں داخل ہو گیا اور برنباس کے ہمراہ انطاکیہ وغیرہ میں جہاں اقوام غیر یہود جن کو جنٹائلز کہتے ہیں آباد تھیں، منادی شروع کی تو یہ سوال اٹھا کہ جو غیر یہودی ایمان لائیں، ان پر احکام توریت کی پابندی لازم ہے یا نہیں، یہ تصفیہ طلب بیت المقدس میں حواریان مسیحؑ کے روبرو پیش ہوا اور رد و قدح کے بعد جو کچھ طے کیا، اس کا ذکر کتاب اعمال میں ہے ..... حواریوں کے اس اجتہاد نے اگرچہ علمائے یہود کی سخت گیریوں اور ظاہری پابندیوں کو توڑ کر شریعت موسوی کو آسان صورت میں

اقوام غیر یہود کے سامنے پیش کر کے ان کو اپنے دین میں داخل کر لیا، لیکن سنہ ۷۰ء میں جب تمام حواری دنیا سے رخصت ہو گئے اور یروشلم کو رومیوں نے فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا اور یہود کی قومیت کا شیرازہ پراگندہ ہو گیا تو غیر یہود اقوام نے حواریوں کی رخصت، شریعت کو اباحت اور پھر بدعت میں ڈھال دیا، بہت سے جعلی خطوط حواریوں کی طرف منسوب کر دیے گئے، شریعت موسوی سے علانیہ بیزاری ظاہر ہونے لگی، نئے نئے عقائد کی بنیاد رکھی گئی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں زندقہ و الحاد کا بازار گرم ہو گیا۔

نیقیہ کونسل نے بالاتفاق اریوس کے اس عقیدہ کو کہ باپ کے مقابلہ میں بیٹا ازلی نہیں ہو سکتا، کفر قرار دیا، کونسل کے فتوی کو قسطنطین نے بزور حکومت نافذ کر دیا، اب مسئلہ تثلیث دین عیسوی کا مسلمہ مسئلہ ہو گیا، اور غیر یہود یعنی رومیوں، یونانیوں اور مصریوں کے توہمات اور رسومات دین عیسوی کے شریک غالب ہو گئے، یہاں تک کہ سو برس کے بعد حضرت مریمؑ کی پرستش بھی بحیثیت خدا کی ماں کے جزو دین ہو گئی، اگرچہ قسطنطنیہ کے بطریق نسطور نے ۴۲۷ء میں اس نئی بدعت کی سخت مخالفت کی، لیکن اب جاہلی عنصر اس قدر غالب تھا کہ نسطور اور اس کے متبعین بھی دین سے خارج کر دیے گئے۔" (تاریخ صحف سماوی ص ۵۳ تا ۵۵)

ڈریپر اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن یہ قدرت اسے (عیسائیت کو) پھر بھی نہ حاصل ہوئی تھی کہ اپنے حریف یعنی بت پرستی کا استیصال کر سکے، دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے، اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا، جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں ...... عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا"

(معرکہ مذہب و سائنس، اردو ترجمہ ص ۶۲ و ۶۵)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اور تو اور راسخ الاعتقاد عیسائیوں تک کو بھی بت پرستی کی علامت عمل سے چنداں اختلاف نہ تھا، اس لیے کہ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ نئی تعلیم کی شاخ میں اگر پرانے عقائد کا پیوند لگا دیا گیا تو مذہب جدید کو بہت جلد ترقی ہو جائے گی، اور آخر کار بت پرستوں کی آمیزش سے پاک ہو کر سچا مذہب باقی رہ جائے گا" (ص ۶۳) مرور قرون نے عیسائیت اور بت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل و مکمل کر دیا" (ایضاً)

ایک مسیحی پادری ایاس اپنی کتاب 'یسوع مسیح' میں لکھتا ہے:

"کلیسا نے بت پرستانہ افکار مسیحی افکار میں داخل کر دیے، اس کے فرستادوں نے تورات کے قانون اور انجیل کے مواعظ یونان کو دے کر ان سے تعبیر کی دقت حاصل کی، اس کے نتیجہ میں ایک نیا سرمایہ وجود میں آیا، جس کو انھوں نے روم کی طرف منتقل کیا، نیز کلیسا نے ان قبائل کی رسموں اور مختلف گروہوں کے طور طریقوں کو قابل احترام قرار دے کر ان کی حفاظت کا ذمہ لیا، اس طرح توحید کے اثرات سے اپنے کو آزاد اور دستبردار کر لیا"[1]

اس سے قبل بتایا گیا تھا کہ نصرانیت کی روح ختم ہونے کا سبب ان کا جبر و تشدد اور غلو کی مجبوریاں بھی تھیں، ذیل میں اس کے ثبوت میں چند بیانات نقل کیے جاتے ہیں،

قاہرہ یونیورسٹی کے دار العلوم کالج میں اسلامی تاریخ و تہذیب کے ایک پروفیسر ڈاکٹر احمد شلبی اپنی کتاب 'مقارنۃ الادیان عن المسیحیۃ' (مسیحیت سے دوسرے مذاہب کا تقابل) میں لکھتے ہیں:

"نصرانیت پر بڑے سخت دور آئے، اور وہ شدید مظالم کا شکار ہوئی، ان مظالم کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ اسے اپنا بہت کچھ کھو دینا پڑا، یہاں تک کہ اس کی اصلیت اور روح ختم ہو گئی، اس کو اپنے بے شمار افراد سے بھی ہاتھ دھونا پڑا، اس سلسلہ میں سب سے اہم شخصیت خود حضرت مسیح علیہ السلام کی ہے

[1] مجلۃ الوعی الاسلامی، کویت۔

اسی طرح نصرانیت نے اپنے بنیادی آخذ و مراجع بھی کھو دیے، چنانچہ آج حضرت مسیحؑ کی اصل انجیل کا پتہ ہی نہیں رہا، یہی وجہ ہے کہ اب اس مذہب کا کوئی صحیح و مستند ماخذ نہیں کیونکہ اصل انجیل تو غائب اور معدوم ہو چکی ہے۔"[1]

عبدالرحمٰن بیگ باجہ جی زادہ لکھتے ہیں:

"نصاریٰ پر مجبوری اور اضطرار کا جو دور گذرا وہی صحیح انجیل کی گمشدگی کا باعث بنا، اور اسی بنا پر وہ متعدد انجیلوں کے چکر اور نئے نئے باطل و واہی خیالات کے جال میں پھنس گئے، اس کو خود اس کثرت سے عیسائی علماء و مورخین نے بیان کیا ہے کہ اس کی تردید ناممکن ہے، انھوں نے اپنی متعدد کتابوں میں نصرانیت کے حالات، اس کے اندر رونما ہونے والے فسادات اور عقائد میں فتور وغیرہ کی پوری صراحت و وضاحت کر دی ہے، در اصل یہی مجبوریاں نصرانیت کے سارے فساد کی جڑ ہیں۔" (الفارق بین المخلوق والخالق)

(۵) نصاریٰ کی گمراہی اور کفر و شرک کی خباثت میں پڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے خدا کی کتابوں کے الفاظ اور انبیاء علیہم السلام کی اصطلاحات و تعبیرات کا صحیح منشا و مدعا نہ سمجھا، علاوہ ازیں انھوں نے بہت سے لفظوں کا مفہوم بدل دیا، انبیاء کی زبان اور طریقۂ بیان نہ سمجھنے کی بنا پر انھوں نے اَب، ابن اور روح القدس کے معنی سمجھنے میں غلطی کی، اور یہی غلطی ان کے عقائد کے فساد کا سرچشمہ بنی اور وہ حلول و تثلیث کے گورکھ دھندے میں پڑ گئے، امام ابن تیمیہؒ نے جا بجا اس نکتہ کی وضاحت کی ہے، ان کے بیان کے جستہ جستہ اقتباسات ذیل میں نقل کیے جائیں گے:

"نصاریٰ انبیاء علیہم السلام کے متعلق کہتے ہیں کہ انھوں نے اب اور ابن کے الفاظ استعمال کیے، حالانکہ ان کی خود اب سے مراد رب اور ابن سے منتخب اور محبوب تھی، کسی نے بھی ان سے یہ نقل نہیں کیا ہے کہ

[1] الوعی الاسلامی، کویت۔

انھوں نے صفاتِ الٰہی میں سے کسی صفت کو لفظ ابن سے تعبیر کیا ہو اور نہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے متعلق یہ کہا ہو کہ اس کا اس سے تولد ہوا یا وہ اس کی مولود ہے، پس اگر حضرت مسیحؑ کے کلام میں یہ آتا ہے کہ باپ بیٹے اور روح القدس کو بپتسمہ دو تو لفظ ابن کی یہ تفسیر کرنا کہ وہ اللہ کی ایک قدیم و ازلی صفت ہے..... حضرت مسیحؑ پر محض افترا ہے، اس لیے کہ ان کی زبان میں ابن سے مراد اللہ کی قدیم ازلی صفت نہیں تھی[1]..... ابن اور روح القدس کے الفاظ حضرت مسیحؑ کے علاوہ دوسروں کے حق میں خود نصاریٰ کے یہاں آئے ہیں، ان کا بیان ہے کہ حواریوں نے کہا: حضرت مسیحؑ نے ان سے فرمایا کہ اللہ میرا اور تمہارا باپ ہے، اور میرا اور تمہارا معبود ہے، تورات میں ہے کہ رب نے حضرت موسیٰؑ سے کہا: "فرعون کی طرف جا، اور اس سے کہہ کہ رب کہتا ہے، اسرائیل میرا پلوٹھی کا لڑکا ہے، اس کو چھوڑ دے تاکہ وہ میری عبادت کرے، اگر تو نے میرے پلوٹھی کے بیٹے کو چھوڑنا منظور نہ کیا تو میں تیرے پلوٹھی کے بیٹے کو قتل کر دوں گا" جب فرعون نے بنی اسرائیل کو نہ چھوڑا تو جیسے خدا نے کہا تھا خدا نے فرعون کو اور فرعون کی قوم کے پلوٹھی کے بیٹوں کو قتل کر دیا..... مزامیر داؤد میں ہے: "تو میرا بیٹا ہے، تو مجھ سے سوال کر میں دوں گا"، اور انجیل میں حضرت مسیحؑ کا یہ قول نقل ہوا ہے: "میں اپنے اور تمہارے باپ اور اپنے اور تمہارے معبود کے پاس جانے والا ہوں"، اور فرمایا: جب تم دعا کرو تو کہو کہ اے ہمارے باپ جو آسمان میں ہے، قدوس تیرا نام ہے، ہمیں فلاں فلاں نعمتیں عطا کر[2]..... نصاریٰ کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ انبیاءؑ کے صریح اور واضح کلام کو چھوڑ کر وہ ایسی تاویلات کے درپے ہو گئے جن پر ان کا کلام سرے سے دلالت ہی نہیں کرتا تھا، چنانچہ ابن کا لفظ خدا کے کلام میں جہاں آتا ہے وہاں اس سے اللہ کی کوئی صفت مراد نہیں ہوتی بلکہ اس کا دوست اور محبوب مراد ہوتا ہے۔" (الجواب الصحیح ج ۳، ص ۱۵۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ ابن کا لفظ تورات و انجیل میں حضرت مسیحؑ کے علاوہ دوسرے اشخاص کے لیے بھی

[1] الجواب الصحیح ج ۳، ص ۱۸۱ و ۱۸۲، [2] ایضاً ص ۱۸۵ و ۱۸۶۔

استعمال ہوا ہے، اس لیے اس کی نوعیت مجاز، کنایہ اور محاورہ وغیرہ کی ہے، ملاحظہ ہو:

"توراۃ، زبور، انجیل اور انبیاءؑ کی پیشین گوئیوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے حضرت مسیحؑ کے متعلق خصوصیت سے یہ ثابت ہو کہ ان کو الوہیت کا اتحاد و حلول حاصل تھا، جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے، ان کی خصوصیت بس اتنا ہی ہے جتنی اس آیت میں مذکور ہے:

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ	مسیح عیسیٰ بن مریمؑ تو بس اللہ کے ایک رسول
وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ[1]	اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف
(نساء: ۱۷۱)	القاء فرمایا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں

نصاریٰ انبیاءؑ کے جن الفاظ و اقوال سے حضرت مسیحؑ کی الوہیت پر استدلال کرتے ہیں، یہ تمام الفاظ و کلمات حضرت مسیحؑ کے علاوہ دوسروں کے متعلق بھی آئے ہیں، اس لیے ان کو الوہیت کے ساتھ مخصوص کرنا بے اصل بات ہے، مثلاً ابن، مسیح، روح القدس کا آپ میں حلول کرنا یا آپ کو الٰہ کے لفظ سے یاد کرنا، یا آپ کے اندر رب کا ظہور یا حلول کرنا یا ساکن ہونا، یا اس کی جگہ پر ساکن ہونا وغیرہ یہ سب الفاظ دوسروں کے لیے بھی موجود ہیں، اور اس سے وہ الٰہ ثابت نہیں ہوتے۔"

(باقی)

---

[1] اس آیت میں عیسائیوں کے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت و ابنیت کی تردید کی گئی ہے اور حضرت مسیحؑ کی اصل حیثیت واضح کی گئی ہے کہ وہ مریم کے بیٹے ہیں، بھلا ایک جنا ہوا شخص خدا اور خدا کا بیٹا کس طرح ہو سکتا ہے، ان کی خصوصیت صرف اس قدر ہے کہ وہ اللہ کے ایک رسول ہیں جن کی ولادت ایک کلمۂ کُن سے ہوئی ہے اس کلمہ کو اللہ نے حضرت مریمؑ کی طرف القاء کیا تھا، اور ان کو روح بھی خدا نے اپنی جانب سے بخشی تھی ان کی اس غیر عادی ولادت سے دھوکہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ ٹھیک اسی طرح کلمۂ کُن سے ہوئی ہے جیسے حضرت آدم کی ولادت کلمۂ کُن سے ہوئی تھی اور دونوں کے اندر یکساں طور پر روح پھونکی گئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ وجود اور زندگی سب کو خدا ہی کے حکم اور اس کی عطا کردہ روح سے ملتی ہے۔

تلخیص و تبصرہ

مستشرقین کی فتنہ انگیزیاں

"اندور کے جناب عبدالحمید صاحب نے دارالعلوم ندوہ کے سمینار میں یہ مقالہ پڑھا، اس کی تلخیص ذیل میں درج ہے"

ایک عرصہ سے مستشرقین اسلام اور اس کے متعلقات پر لکھتے رہے ہیں، انھوں نے اسلامی لٹریچر میں بڑا اضافہ بھی کیا ہے، ان کی تحریریں عموماً انگریزی زبان میں ہوتی ہیں، لیکن ان کی ان کاوشوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد اسلام کی نشر و اشاعت کم اور اس پر تنقید و اعتراض زیادہ ہے،

حال میں ایک اردو روزنامہ سے یہ اطلاع ملی کہ گزشتہ دہائی میں صرف امریکہ میں اسلام سے متعلق تقریباً تیس ہزار کتابیں شائع ہوئیں، ان کے علاوہ رسائل و جرائد میں مضامین اور کتابچے شائع ہوئے، اور ریڈیو اور ٹی وی پر مضامین پیش کیے گئے،

اسلام پر اس خاص توجہ کا یقیناً کوئی جذبہ اور محرک ہے، جو ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں، اصل اس عہد کی ایک علمی صلیبی جنگ ہے جس میں بجائے سیف و سنان کے قلم و قرطاس مصروف پیکار ہیں، آئندہ سطور میں بغیر کسی ترتیب کے صرف چند مستشرقین کی کتابوں کے کچھ اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں جن سے ان کا مقصد تاریخ اسلام سے ان کی ناواقفیت اور ان کی علمی دجل و فریب کا اندازہ

کیا جاسکتا ہے، ایک مستشرق ڈبلو مونٹگمری واٹ اپنی کتاب "محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین" میں لکھتا ہے :-

اس کا قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ نماز کے پانچ اوقات کا تعین (حضرت) محمدؐ کے زمانہ حیات میں ہوا، بلکہ بعد کی چیز ہے، (ص ۱۰۰) ...... (حضرت) محمدؐ (حضرت) زیدؓ سے ملاقات کی نیت سے تشریف لے گئے، وہاں زید موجود نہیں تھے، لیکن آپ کی نگاہ ان کی بیوی زینب پر پڑی، جو نازک لباس میں تھیں، نظر پڑتے ہی آپ ان پر فریفتہ ہوگئے...... (حضرت) خدیجہؓ کے سوا آپ کی تمام ازواج نوجوان تھیں، اور اکثر تو نوعمر تھیں...... اس کے بھی شواہد نہیں ملتے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کی اس عیش کوشی اور شہوت رانی کو ناپسند کرتے ہیں، (ص ۱۵۷، ۱۵۸) ...... دوسری جگہوں کی طرح عرب میں بھی یہ تصور تھا کہ اگر مرد و عورت کہیں تنہا رہ گئے تو اس کا نتیجہ جنسی تعلق ہی ہوگا، ...... آخر کار (حضرت) محمدؐ نے اس معاملہ کا فیصلہ (حضرت) عائشہؓ کے حق میں کیا، ان کے خلاف کوئی مضبوط شہادت نہ تھی، اس درمیان میں زیادہ وقت گذر گیا، جس سے یہ یقین ہوا کہ وہ حاملہ نہیں ہیں،

(ص ۱۶۴ - ۱۶۵)

سفیروں اور قاصدوں کے بارہ میں اس دور میں کسی عظمت کا تصور نہ تھا" (صفحہ ۱۸۷)

مونٹگمری واٹ نے اپنی کتاب میں اسی طرح جابجا رسول اللہؐ کی ذات مبارک سے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، اور آپ اور آپ کے صحابہ کرام کی طرف غلط باتیں منسوب کی ہیں،

ایک کتاب "دی اسٹڈی آف ریلیجنز" (مطالعہ مذاہب) ایچ ڈی لیوس اور رابرٹ لاس سلیٹر کی ہے، ڈاکٹر لاس سلیٹر ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک قابل اور ریٹائرڈ پروفیسر ہیں، وہ اسلام کے عزائم کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"انھوں نے ایک ہی قسم کا رویہ اختیار کیا، قافلوں کو روکنا، ان کو لوٹ لینا بدوؤں کو قتل یا پھر قید کرلینا، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لینا، لیکن ان حملوں کے بعد وہاں کی مجلسوں میں (حضرت) محمدؐ کی گفتگو سنی جاتی تو شاہدوں کو معاملہ دوسرے ہی رنگ میں نظر آتا (ص ۱۰۲) ...... اپنی رسالت کے زمانہ میں موسیٰؑ، نوحؑ، یوحناؑ اور عیسیٰؑ کے عظیم سلسلہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ان کا پیام وہی ہے جو ان پیغمبروں کا تھا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان قصوں کو انھوں نے یہودی ماخذ سے لیا ہے، جیسا کہ پہلے دعویٰ کیا گیا ہے، یا پھر ان کا ماخذ شامی عیسائی ہیں جیسا کہ اب کہا جاتا ہے (ص ۱۰۲) ...... یہ (حضرت عمرؓ) تھے، جو مدینہ کی ہجرت میں آپ کے رفیق تھے (ص ۱۰۳) ...... مکہ میں (حضرت) محمدؐ کی حیثیت ایک پیغمبر کی تھی، مدینہ میں وہ ایسے منصوبہ ساز سیاست داں ہوگئے، جہاں وہ مسلمانوں کی مدافعت کرنے اور ان کو ایک نئی کمیونٹی بنانے میں مشغول رہے، (ص ۱۰۴) ...... مدینہ میں کافی ضروریات پیدا ہوتی گئیں، جس سے اس کی صورتِ حال نازک ہوتی گئی، یہ ایک چھوٹا سا نخلستان تھا، مسلمانوں کی روز افزوں آبادی کے پیش نظر غذا کی فراہمی ایک ضرورت تھی، اس لئے مکہ جانے والے قافلوں پر حملے کئے گئے، اور ریگستانوں میں ان کو لوٹا گیا، (ص ۱۰۵) ...... بعد کے ناقدین کا یہ الزام ہے کہ انھوں نے اپنی تحریک کے لئے وحی و الہام کو اپنی سہولتوں کی خاطر گھڑ کر پیش کیا، مثلاً یہ کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ گو شہر حرم (عارضی صلح کے مہینوں) میں جنگ قابلِ ملامت ہے، لیکن خدا کی راہ میں جنگ نہ کرنا اس سے بھی بڑھ کر

لائقِ ملامت ہے، (ج ۲- ص ۲۱۴) ...... مکہ کے پیغمبر اپنے متبعین کو تو صراطِ مستقیم کی سختی سے تاکید کرتے تھے لیکن کہا جاتا ہے، کہ وہ خود عیاش شخص تھے، (ص ۱۰۵)

ایک دوسری کتاب دی سوشل اسٹرکچر آف اسلام مولفہ ریوبن لیوی، کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہوئی ہے، اس سے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں،

"اب تک یہ سوال حل طلب ہو کہ آپ اپنے پیغام کو اپنی سرزمین تک محدود رکھنا چاہتے تھے یا اس سے باہر بھی اس کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے، (ص ۱،۲) ...... وہ اپنی وحی والہام میں کثرت سے انجیل کی ان ناقص اور گنجلک روایتوں کو بیان کرتے جو انھوں نے یہودیوں یا عیسائیوں سے سنی تھیں، اور وہ اس سے اپنی برتری کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ (ص ۳) ...... جیسے ہی ان کے پاس اسلحہ فراہم ہو گئے، تو وہ جذبۂ انتقام میں مکہ کے کفار کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھے اور اپنے پیرؤں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ یہ خدا کی راہ میں جنگ ہے، مکہ کی روایتی اور مقدس جگہ پر قبضہ کرنا، ان کے لئے ایک ذاتی وقار کی بھی بات تھی، (ص ۲۰) ...... جہاں تک اسلام کی اشاعت اور مسلم حکومتوں کی وسعت کا تعلق ہے، شروع میں یہ نظر انداز کرنے کے لائق تھا، کیونکہ عرب، ترکوں کی طرح لوٹ مار کر کے مطمئن ہو جاتے، ان کو اپنی فکر مستقل طور پر رہی (ص ۵۴) ...... جب (حضرت) محمدؐ[۴] نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو وہ قبیلۂ قریش کے باضابطہ فرد تھے، لیکن وہ ادنیٰ درجہ کی نسل سے تھے، ان کا پیشہ اونٹ چرانا تھا، اس لئے ان کو کامیابی حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹیں رہیں (ص ۵۶) ...... اس کے بعد آپ سے رشتہ داری، شرافت و نجابت کے لئے کسوٹی مانی جانے لگی، حتیٰ کہ آپ سے معمولی درجہ کی قرابت بھی قبیلۂ قریش

میں شامل ہونے کا ذریعہ بن گئی اور اعلیٰ امتیاز کی نشانی سمجھی جانے لگی، (ص ۱۴۸) ...... محمد کو زید کی بیوی میں دلکشی نظر آئی، انھوں نے زید کو ترغیب دی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیں تاکہ وہ اس سے نکاح کر سکیں (ص ۱۵۵)

اسی مصنف نے قرآن کی آیات (۱۷: ۸) (۱۰: ۱۱۶) (۲: ۲۳۹) نقل کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نماز کے صرف تین مقررہ اوقات ہیں (ص ۱۵۹) اور یہ کہ

گرچہ قرآن نے متعدد جگہوں پر زکوٰۃ دینے کی ترغیب دی ہے لیکن یہ رقم کتنی ہوا کیا ہو، اور کس کو دی جائے، اس کی صراحت کہیں نہیں ملتی، (ص ۱۵۹)

ان نام نہاد مستشرقین کی تقریباً اکثر کتابوں میں اس قسم کی تحریفات، الزامات اور دروغ گوئیوں کے نمونے ملتے ہیں، مستشرقین کی ان الزام تراشیوں کے رد میں میرے علم میں کوئی قابلِ ذکر انفرادی یا اجتماعی کوشش نہیں کی گئی، معلوم نہیں کیوں اس کی طرف اب تک توجہ نہیں دی گئی، میری رائے ہے کہ اس مقصد کے لئے کم از کم چند علماء اور محققین پر مشتمل ایک ادارہ قائم ہو، اور ماہانہ نہ سہی تو ایک سہ ماہی مجلہ شائع کیا جائے تاکہ مستشرقین کی یاوہ گوئیوں کا ازالہ ہوتا رہے،

مقالاتِ سلیمان، جلد دوم

اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی و تحقیقی مضامین کے علاوہ، مستشرقین یورپ کے سیرت اور تاریخ اسلام کے اعتراضات کے جواب میں بھی مضامین ہیں، مثلاً واقدی، اور سیرت میں مستشرقین کی ایک نئی غلطی، پھر واقدی اور کتب خانہ اسکندریہ وغیرہ،

قیمت :- ۱۷-۰۰

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

امداد المشتاق: مرتبہ مولانا اشرف علی تھانویؒ مع مقدمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، بڑی تقطیع کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۷۶، قیمت مجلد ۳۵ روپیے، غیر مجلد ۳۰ روپیے، مکتبۂ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے پیر و مرشد اور مشہور امام طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے حالات و ملفوظات کا ایک مجموعہ امداد المشتاق الی اشرف الاخلاق کے نام سے منشی مشتاق احمد پٹواری کیرانوی کی فرمایش پر لکھا تھا جو مرقومات امدادیہ کے ساتھ پہلی دفعہ ۱۹۲۵ء میں تھانہ بھون سے چھپا تھا، مگر اب یہ دونوں مجموعے نایاب تھے، اس لیے مکتبۂ برہان نے انھیں دوبارہ شایع کیا ہے، چند ماہ قبل ان صفحات میں مرقومات امدادیہ کا ذکر ہوا تھا، اب امداد المشتاق کی فوٹو کاپی علٰحدہ شایع کی گئی ہے، گو اس کی ترتیب و تالیف قدیم انداز کے مطابق ہے، مگر اپنے اہم مندرجات کی بنا پر طالبین و سالکین کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے، اس میں حاجی صاحبؒ کے حالات و باطنی کمالات کے علاوہ سلوک و تصوف کے گوناگوں دلچسپ نکتے اور مفید باتیں بھی درج ہیں، نیز یہ مجموعہ حضرت تھانویؒ کے قلم سے ہونے کی بنا پر مستند بھی ہے، مرقومات امدادیہ کی طرح اس مجموعہ پر بھی جناب نثار احمد فاروقی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، اس میں امداد المشتاق کی تالیف و ترتیب اور مآخذ کے علاوہ بعض مروجہ مسائل میلاد، نیاز، عرس، سماع اور تعظیم قبور وغیرہ کے بارے میں حضرت حاجی صاحبؒ کے توسع کا ذکر بھی ہے، جن کے خود ان کے نامور خلفا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا تھانویؒ وغیرہ قائل نہ تھے، مقدمہ نگار نے

مولانا تھانوی کے تعلق سے بعض کے متعلق ان کے اختلاف کی صراحت کر دی ہے، مقدمہ کے دوسرے حصوں میں حاجی صاحبؒ کے خاندان و طریقت کے شجرے، سلسلۂ طریقت کے بعض اہم بزرگوں اور نامور خلفاء کے حالات بھی درج ہیں، اور ان کے غیر مطبوعہ خطوط کا عکس، مختلف رہایش گاہوں اور مسجدوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں، آخر میں مولوی نور الحسن راشد کے قلم سے ایک ضمیمہ ہے، اس میں حضرت حاجی صاحبؒ کے چار اساتذہ مولانا سید محمد قلندر محدثؒ، مولانا عبد الرزاق جھنجھانویؒ، مولانا ابو الحسن کاندھلوی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کا تذکرہ ہے، لائق مقدمہ نگار تصوف اور صوفیہ کے بڑے قدر دان اور تحریر و تصنیف کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں، اس کتاب پر ان کا مقدمہ نورٌ علیٰ نور کے مصداق ہے، انھوں نے مقدمہ میں مذکور بعض ناموں کے حالات بھی حواشی میں لکھے ہیں، مگر بعض اشخاص کا تذکرہ رہ گیا ہے، ص ۹۰ تا ۹۳ پر حاجی صاحبؒ کے خادم خاص میاں عبد الرحیم کی ایک نادر تحریر درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحبؒ کی وفات ۱۲ رجمادی الثانی ۱۳۱۷ھ کو دن گذار کر ۲ بجے شب میں ہوئی گویا ۱۳ رجمادی الثانی جمعرات کو، مگر مولانا احمد حسن محدث امروہوی کے مکتوب (ص ۹۴ تا ۹۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ انتقال ۱۲ رجمادی الثانی کو صبح کی اذان کے وقت ہوا، اس فرق پر فاروقی صاحب کی نظر نہیں گئی، اور انھوں نے اس کے متعلق کوئی صراحت بھی نہیں کی۔

تاریخ اطبائے بہار (جلد اول) مرتبہ حکیم محمد اسرار الحق صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۹۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ روپے۔ پتے (۱) بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴ (۲) حکیم محمد اسرار الحق، انور منزل، محلہ دریاپور قطب الدین پٹنہ سیٹی۔

مسلمانوں نے علم ادیان کی طرح علم ابدان کی جانب بھی ہمیشہ بڑا اعتنا کیا، انکے دور حکومت میں اور اسکے بعد بھی ہندستان کا گوشہ گوشہ حاذق اطبا اور نامور حکما سے معمور تھا، مگر اب طب و حکمت کی ناقدری کی وجہ سے اطبا ناپید ہوتے جا رہے ہیں، البتہ حکیم عبد الحمید مالک ہمدرد دواخانہ کی مسیحائی نے اس فن کو ابھی تک زندہ رکھا ہے وہ ایسی ناموافق ہوا میں بھی اسکا چراغ

روشن کیے ہوئے ہیں، اس طرح کے مستثنیٰ لوگوں اور طب و حکمت کے پرستاروں میں حکیم محمد اسرار الحق پروفیسر گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ بھی ہیں، انھوں نے یہ کتاب لکھ کر بہار کے طبیبوں کا نام ضایع ہونے سے بچالیا، اس میں گذشتہ دو صدی کے تقریباً سوا سو بہاری طبیبوں کا تذکرہ ہے، ان میں چند کے سوا سب ٫٫ پکے ہیں بعض اطبا کے حالات و کمالات کے علاوہ انکے مجرب نسخے بھی دیئے ہیں طبیبوں کی فہرست میں بعض ایسے ارباب کمال بھی شامل ہیں جو دوسری حیثیتوں سے زیادہ مشہور و ممتاز تھے، جیسے مولانا سید شاہ ابو الحسن فرد قادری مجیبی، مولانا سید برکات احمد مونگیری ثم ٹونکی، مولانا ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری صاحب اصح السیر، مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی صاحب آثار السنن وغیرہ، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کا خاندان کئی پشتوں سے طب و حکمت سے وابستہ رہا ہے اس کتاب میں انکے جد محترم حکیم سید محمد عرف میر محمدی، اور والد بزرگوار حکیم سید ابو الحسن مرحوم اور بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب مرحوم کا اسی حیثیت سے تذکرہ ہے، بعض خواتین اور ہندو اطبا کا ذکر بھی ہے، شروع میں ان کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس میں بہار کی مختصر تاریخی اہمیت اور اس سرزمین سے اطبا کی وابستگی کا حال بیان ہوا ہے اگو اطبا کے سنین ولادت و وفات اور تحصیل علم و فن کے ذکر سے کوئی تذکرہ خالی نہیں ہے لیکن چند کے سوا تمام تذکرے بہت مختصر اور ناکافی ہیں اور بعض سرسری نوعیت کے بھی ہیں، مصنف کو مزید تلاش و جستجو سے طبیبوں کے متعلق معلومات [illegible] کرنا چاہیے تھا، کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی ہیں،

القراءۃ العربیۃ الجزء الاول و الثانی	مرتبہ مولانا عبد المجید اصلاحی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۵۲ و ۶۲، قیمت فی جزء پانچ روپے، پتہ :۔ مکتبہ الاصلاح، سرائمیر، اعظم گڈھ یوپی

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے عربی کے مبتدیوں کو نحو و صرف کے قواعد سکھانے کے لیے اردو میں آسان اور سادہ طریقہ پر جدید طرز کے دو مختصر رسالے اسباق النحو حصہ اول و دوم لکھے تھے، جو تجربہ کے بعد بہت مفید ثابت ہوئے، البتہ مولانا نے طلبہ کی ذہانت اور استاذ کی رہنمائی پر اعتماد کرکے ان میں مثالیں کم دی تھیں، اب مولانا عبد المجید اصلاحی نے اسباق النحو کے نحوی و صرفی مسائل کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے زیر نظر کتاب میں ان کی مثالیں قلمبند کی ہیں اور تدریج کے خیال سے پہلے صرف الفاظ دیے ہیں پھر چھوٹے چھوٹے عربی جملے اور فقرے، اور آخر میں مختصر قصے اور مضامین بھی دیے ہیں، وہ ایک لایق اور تجربہ کار استاد ہونے کے علاوہ عربی ادب و انشاء کا اچھا ذوق بھی رکھتے ہیں، اس لیے یہ کتابیں مفید اور کارآمد ہیں، عربی کے مبتدیوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

"ض"